راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا ۱۵واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly
Arxang
Lahore

مارچ ۲۰۱۳ء
جلد ۱۵ شمارہ ۳

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی
مدیر: حسن عباسی

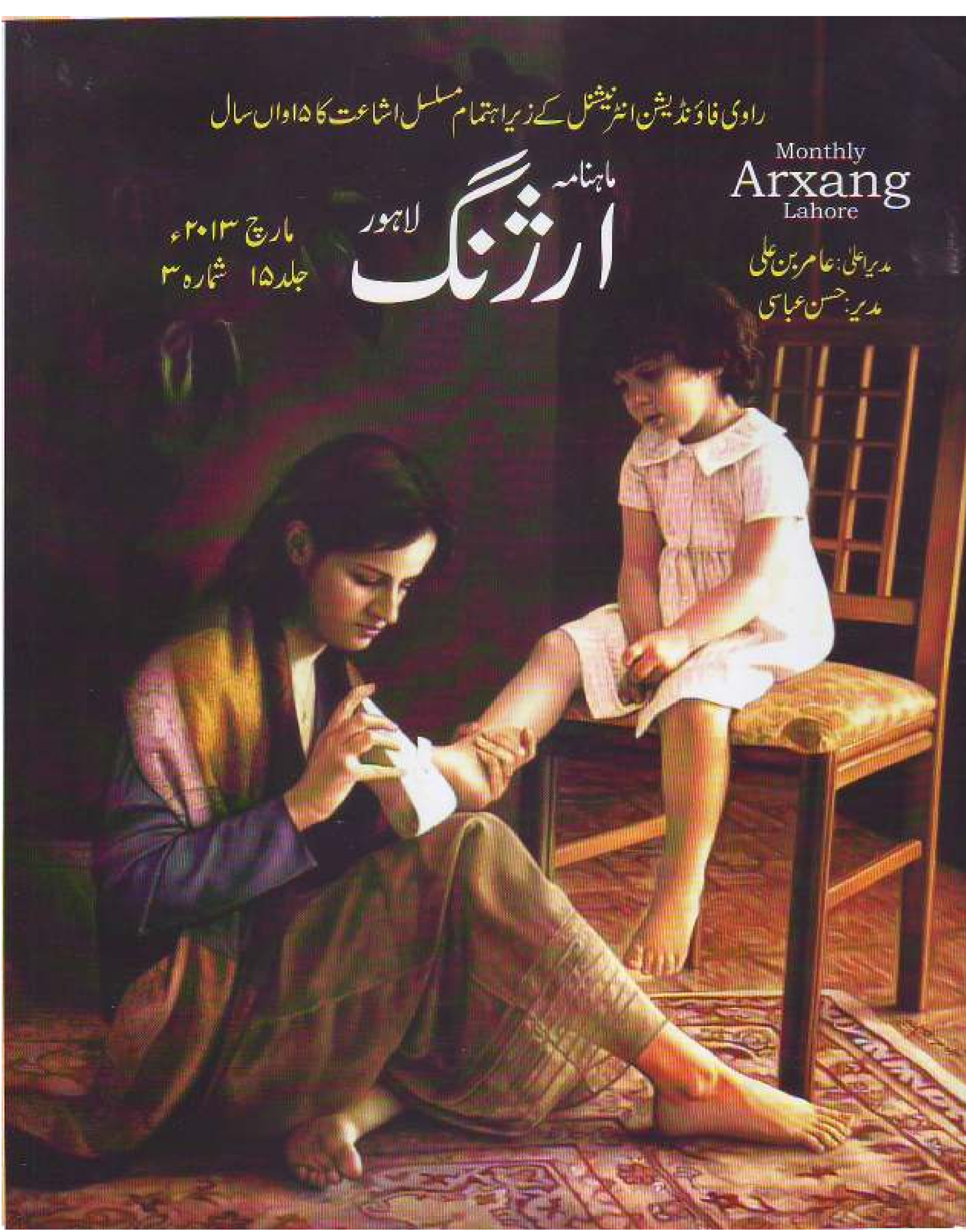

نامور شاعر، کالم نویس اور مترجم عامر بن علی کی کتب کے

تازہ ایڈیشن

شائع ہو گئے

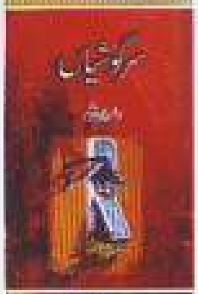

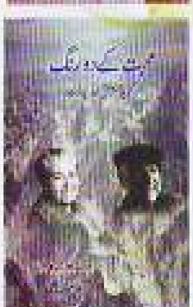

حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

ناشر نستعلیق مطبوعات F-3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اُردو بازار لاہور
0423-7351963 - 0300-4489310
email: nastalique786@gmail.com

[illegible]

MONTHLY ARXANG LAHORE

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 15 مارچ 2013ء شمارہ نمبر ۳

حمدیہ کلام ' ۲
نعتیہ کلام: مہر جہانی، ریاض حسین زیدی، عمران نقوی، ابراہیم حسان، گلشن، ساجد سعیدی ' ۳ تا ۷
مضامین: ○ وال ولیا / ظفر اقبال ' ۹
○ عطاء الحق قاسمی اور ان کا فن / خورشید رضوی ' ۱۱
○ پروین شاکر.....ایک باصلاحیت اور خوش قسمت شاعرہ / زیب النساء زیبی ' ۱۳
○ منٹو سیاسی مورخ / ثمینہ سید ' ۱۷
○ ڈاکٹر صغرا صدف کا "وعدہ" / حسن عباسی ' ۲۰
○ عابد کاظمی...... دل سے دل تک کا مسافر / ابرار ندیم ' ۲۲
○ محبتوں کا شاعر......عامر بن علی / شبنم لطیف ' ۲۶
تراجم: "ہونہار بے بی کے اتنے لمبے ہاتھ" / حافظ مظفر محسن ' ۲۷
افسانے: ○ حنوط شدہ ہاتھ......موسیاں / ترجمہ: ڈاکٹر کوثر محمود ' ۲۹
○ ہست نیست / نیلم احمد بشیر ' ۳۳
○ وہ قربتیں یہ فاصلے / ڈاکٹر انور نسیم ' ۳۷
○ حیرت و مستی / ڈاکٹر فوزیہ تبسم ' ۳۷
○ پتنگ، روٹی اور عشق / دستگیر شہزاد ' ۴۲
○ آسمان، دائرہ اور میں / نسیم سکینہ صدف ' ۴۶
شعری گوشے: خالد شریف، قیوم طاہر، یوسف مثالی، فرحت زاہد، زاہد سعید، تسنیم کوثر، افضل گوہر، کنور امتیاز احمد، نسیم عباسی، غضنفر عباس، عامر سہیل، شبہ طراز، مرتضیٰ ساجد، عنبرین حسیب عنبر، الطاف صفدر، اشرف نقوی، اسد بیگ، فرزانہ جاناں، ضیغم عدیل کاظمی، اعجاز دانش، اسما سحر ۴۸ تا ۶۹
متفرق غزلیں: ۷۰ تا ۷۳
○ روس کی ایک جھلک / جمیل آذر ' ۷۴
ادبی خبریں ' ۷۷
تبصرۂ کتب ' ۸۱
خطوط ' ۸۲

[illegible]

چیف ایڈیٹر: عامر بن علی

مدیر
حسن عباسی

مدیران اعزازی
ڈاکٹر صغرا صدف، ابرار ندیم

ڈپٹی ایڈیٹرز (اعزازی): زبیر بشیر، صفدر علی صفدر (کویت)
اسسٹنٹ ایڈیٹر: کامران ندیم

زر سالانہ مع ڈاک خرچ مبلغ 1000 روپے
بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں

email: nastalique786@gmail.com

برائے خط و کتابت
نستعلیق پبلی کیشنز
الفیر وز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
0092+423+7351963 / 0300-4489310

E.Mail: arzangpk@yahoo.com

FAR EAST MARKETING CO.
SAMARIA MANSION 605 KOENJI-MINAMI 1-6-6,
SUGINAMI-KU, TOKYO, 166-0003,JAPAN
E-MAIL: femc1@hotmail.com

حمدیہ کلام

نگر نگر ہے تری تجلی چمن چمن ہے جمال تیرا
نگر نگر ہیں ترے اُجالے نظامِ ہستی کمال تیرا
نشیب تیرے فراز تیرے ازل ابد کے حساب تیرے
تری حقیقت رہے گی قائم نہیں ہے ممکن زوال تیرا
کمال حُسنِ ربوبیت سے تو ہر نفس میں سما گیا ہے
زباں زباں ہے تری حکایت نظر نظر ہے سوال تیرا
چہار عالم میں تیری حکمت سے ماہ وانجم رواں دواں ہیں
ترا ہے مشرق ترا ہے مغرب جنوب تیرا شمال تیرا
ترے فرشتے ترے پیمبر ترا محمدؐ تری خدائی
تری مساجد ترے نمازی تری اذانیں بلال تیرا
ترے تعلق سے آج ثاقبؔ پہ ہر طرح کی عنایتیں ہیں
ملا ہے اس کو جمالِ ہستی ہوا ہے جب سے وصال تیرا

احسان اللہ ثاقب/لاہور

کبھی تم نے یہ سوچا ہے

کبھی تم نے یہ سوچا ہے
دُعائیں گڑگڑا کر مانگنے والو
اسے آواز دیتے ہو
جو برسوں سے تمہارا اپنا سینہ کھٹکھٹاتا ہے
اُسے کیا دیکھ پاؤ گے
جو تا حدِ نظر ہو کر بھی بیگانہ رہتا ہے
دیارِ غیب سے اس کو بلاتے ہو
جو حاضر خود تمہاری اپنی تنہائی میں رہتا ہے
جو حاضر خود تمہاری اپنی تنہائی میں رہتا ہے
جسے معبود کہتے ہوئے تحقیر کرتے ہو
اُسی کی قید میں رہ کر اُسے زنجیر کرتے ہو
کبھی تم نے یہ سوچا ہے نہیں تم نے نہیں سوچا
اُسے تم نے نہیں سوچا

سید مبارک شاہ/راولپنڈی

دے جبینوں کو سجدے، کرم اے خدا
نور سے بھر دے سینے، کرم اے خدا
نوعِ انساں خسارے میں ہے، شک نہیں
دور کر دے خسارے، کرم اے خدا
خوف کے گنبدوں میں مقید ہیں ہم
کھول دے ہم پہ رستے، کرم اے خدا
جس قدر سنگ ریزے ہیں دامان میں
کر دے اُن کو ستارے کرم اے خدا
دے رہے تھے تمازت جو اُمید کو
بجھ گئے وہ شرارے کرم اے خدا
بھیج بارانِ رحمت کہ تخلیق کے
ہو گئے خشک چشمے، کرم اے خدا
چھا گئے ہیں اندھیرے جو اطراف میں
کر دے ان کو اُجالے، کرم اے خدا
ہم تمازت غضب کی نہ سہہ پائیں گے
رکھ ہمیں سائے سائے، کرم اے خدا
جو ہے جعفرؔ حسن نامراد ازل
رکھ اُسے اپنے دوارے، کرم اے خدا

مالک ہر جہاں تو بڑا مہرباں
میرے دل میں ہے تو ہے تو ہی انس جاں
سنگ عصیاں سے دامن بھرا ہے میرا
صدقے محبوبؐ کے بخش دے میری جاں
ہم گنہگار ہیں ہم سیہ کار ہیں
ماسوا اب ترے در کے جائیں کہاں
ہم پہ ہو اب کرم دور ہوں سارے غم
ختم ہو جائے اب سب کی آہ و فغاں
زندگی یہ مری بندگی وہ ہے تری
بن سکے اس زمیں پر حسیں کہکشاں
خالی ہاتھوں میں اب اے جہاں بھر کے جہاں
اب تھما دے خودی کی تو تیغ فساں
خالق دو جہاں تجھ سے ہے التجا
سر پہ پھیلا دے تو فضل کا سائباں

عبدالمجید چٹھہ/لاہور

مری لوح فکر وشعور پر کبھی نور شوق اُتار دے
مرا لفظ لفظ اُجال دے، مرا حرف حرف نکھار دے
مرے دشتِ شعر وسخن کو اب کوئی تازہ ابر بہار دے
مری شاخِ فن رہے نم سدا، اسے غنچہ وگل وخار دے
کوئی ایسا مصرع تر کہوں، کوئی ایسا حرفِ وفا لکھوں
جو مجھے حیات دوام دے، مری عاقبت کو سنوار دے
نہ جبینِ صبح ازل مری، نہ ہی چشمِ شامِ ابد مری

فرتاش سید/دوحہ

مہر وجدانی / کراچی

اس کے آنسو دامن رحمت میں بن جائیں گہر — وہ جو یادِ مصطفیٰ میں اشک افشانی کرے

مہر وجدانی ۱۹۳۰ء کو بریلی (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ جامعہ علی گڑھ اور جامعہ کراچی سے فارغ التحصیل ہیں۔ اُردو، ہندی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ اُردو اور انگریزی زبان میں ۱۰۰ درسی اور اخلاق کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی کے لیے مختصر کہانیاں اور مزاحیہ ڈرامے لکھے۔ بچوں کے لیے نظمیں، گیت، ملی نغمات، مزاحیہ خاکے اور گیتوں بھری کہانیاں بھی تحریر کیں۔ ۱۹۷۲ء میں پاکستان کلچرل اکیڈمی کی بنیاد رکھی۔ مختلف اخبارات و رسائل کے مدیر رہے۔ مجموعہ کلام تجلیات، مصدرِ انوار اور رحمت للعالمین شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی شاعری ہماری کلاسیکی روایت کی امین ہے۔ اُن کا نعتیہ کلام عقیدت کے اشکوں میں گندھا ہوا ہے۔ (ارژنگ)

لطف دیکھا ہے ترا، تیرا کرم دیکھا ہے
منبع جود و سخا تیرا حرم دیکھا ہے

کج کلاہان زمانہ سپر انداز ہوئے
اہل عالم نے ترا جاہ و حشم دیکھا ہے

تیرے روضے پہ نظر آیا ہے، یہ منظر بھی
تاج والوں کی جبینوں کو بھی خم دیکھا ہے

جاں نثاروں کی تو دنیا ہی بدل دی تو نے
دشمنوں پہ بھی ترا لطف و کرم دیکھا ہے

بعد تخلیق، نگاہیں جو اُٹھیں آدم کی
عرش پہ کلمہ توحید رقم دیکھا ہے

ان کا آیا ہے بلاوا میں رہا جاتا ہوں
قافلے والوں کو بادیدۂ نم دیکھا ہے

ہجر سرکار مدینہ میں ہوں سرشار بہت
میں نے یہ غم بھی باندازِ کرم دیکھا ہے

عالم بالا کی مخلوق ہے حیراں، اب تک
عرش، سرکار کے جو زیرِ قدم دیکھا ہے

گنبد خضریٰ پہ تھی مہر الٰہی کی چمک
بندہ و رب کے تصور کو بہم دیکھا ہے

میں تو غلام ابن غلام رسولؐ ہوں
دونوں جہاں میں وقف بنام رسولؐ ہوں

دنیا کسی بھی نام سے آواز دے مجھے
اللہ جانتا ہے غلام رسولؐ ہوں

قرآن تو کلام الٰہی ہے، اس کے بعد
مصروف اتباع کلام رسولؐ ہوں

میری وفا نے عرش پہ پہنچا دیا مجھے
اب میں بھی اک ستارۂ بام رسولؐ ہوں

وہ صید ہوں کہ جس پہ ہیں آزادیاں نثار
یعنی اسیر حلقۂ دام رسول ہوں

میرے تصورات کی پرواز دیکھیے
طیبہ کی سمت محو خرام رسولؐ ہوں

چاروں طرف ہے نور کی چادر تنی ہوئی
گویا کہ میں مقیم خیام رسولؐ ہوں

ان کی نگاہ مجھ کو بنا دے گی کیمیا
مانا کہ میں ابھی مس خام رسولؐ ہوں

ذرہ پہ یہ کرم ہوا، وہ مہؔر بن گیا
زینت فزائے صبح، ز شام رسولؐ ہوں

دل سے جو محبوب خدا کی ثنا خوانی کرے
وہ محبت کی زباں میں گوہر افشانی کرے

ان کے در کا جو گدا ہو کار سلطانی کرے
اور جو ہو جائے غلام ان کا، جہانبانی کرے

باخدا، تنویر محبوب خدا جس دل میں ہو
خود خدائے پاک اس دل کی نگہبانی کرے

چاہتا ہے جو، در جنت پہ استقبال ہو
وہ محمدؐ مصطفیٰؐ کے در کی دربانی کرے

جو محمد مصطفیٰ صل علیٰ کا ہو گیا
ہر نفس اللہ بھی رحمت کی ارزانی کرے

اُس کے آنسو دامن رحمت میں بن جائیں گہر
وہ جو یادِ مصطفیٰ میں اشک فشانی کرے

دل میں بھی ہو جوش پیدا روح بھی سرشار ہو
یاد سرکار مدینہ کیف سامانی کرے

کیا عجب ہے خواب میں دیدار ہو جائے مجھے
میرا آقا یہ عنایت مجھ پہ روحانی کرے

مہؔر طیبہ کے گلی کوچوں کا ہو جاروب کش
اپنی کرنیں جمع کر کے، وہ نگہ رانی کرے

مکہ نظر آئے کہ مدینہ نظر آئے
اللہ کے محبوب کا جلوہ نظر آئے

یارب ہو مرا ذہن، کچھ اس طرح مجلا
آئینہ بنے، اس میں مدینہ نظر آئے

چلتا تو ہوں اے خضر، مگر شرط یہی ہے
جس سمت چلوں، ان کا ہی جلوہ نظر آئے

ریاض حسین زیدی/

للہ الحمد ازل سے ہوں میں اُن سے منسوب — وہ جو ممدوحِ خلائق ہیں خدا کے محبوب

سیّد ریاض حسین زیدی خاندانِ سادات گیسودراز کے چشم و چراغ ہیں۔ اُن کے تین نعتیہ مجموعے ریاضِ مدحت، جمالِ سیّدِ لولاک اور ذکر شہِ والاؐ پر قومی اور صوبائی سیرت ایوارڈ دیے گئے۔ اُن کا ہر شعرِ نعت دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے اور دل کی گہرائیوں میں اُترنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ زبان و بیان پر حیرت انگیز قدرت، ذخیرۂ الفاظ کی بے پناہ وسعت اور دل پذیر و جاں نواز اسلوب کی بنا پر عہدِ حاضر میں ان کی نعت گوئی کو منفرد ترین کہنا نہایت مناسب ہوگا۔ (ڈاکٹر سیّد قاسم جلال، بہاولپور)

عجب سرور ہے باہر بھی میرے اندر بھی
بفیضِ نعت، قلندر بھی ہوں سکندر بھی

ہے کائنات بس اک آپ کی رضا کے لیے
ہیں کوہ و دشت و چمن آپ کے سمندر بھی

ہر ایک حرف مرا آپ کا ثنا خواں ہو
دعا یہ دل میں ہے مستور بھی، نوا گر بھی

دلوں کو آپؐ نے حسنِ عمل کا نور دیا
اندھیری رات کا رستہ ہوا منور بھی

ریاضؔ خواب میں گر آپؐ کی زیارت ہو
زہے نصیب ہے تعبیر اُس کی خوش تر بھی

ہر گام، ہر مقام پہ وہ کامیاب ہے
قربِ حضورؐ جو ہوا بہرہ یاب ہے

عہدِ خزاں کی بے پر و بالی سے کیا غرض
سایہ فگن جب آپؐ کا سرسبز خواب ہے

مہرِ عربؐ کی ایک نظر جس پہ پڑ گئی
دیکھا تو پھر وہ ذرہ نہیں، آفتاب ہے

قلب و نظر میں عشقِ نبیؐ کے رچاؤ سے
آیا جہاں میں سب سے بڑا انقلاب ہے

میرا ریاضؔ نعت بہار آفریں ہوا
صلِ علیٰ حضورِ نبیؐ مستجاب ہے

سفر کٹھن ہے تو کیا، مہرباں آپ کی ذات
رہِ حیات میں منزل نشان، آپ کی ذات

جو بات آپؐ کی ہے، وہ کسی کے بس میں نہیں
خدا کے مرتبے کی رازدان آپؐ کی ذات

فضائیں آپؐ کی آمد سے مشکبار ہوئیں
خوشا نصیب ہے کہ گلستان آپؐ کی ذات

غموں کی دھوپ میں جلتے ہوئے بدن کو نوید
سلگتی رُوح کو ہے سائبان آپؐ کی ذات

رہِ حیات میں اب گمرہی کا خوف نہیں
ہے میرِ قافلہ دو جہان آپؐ کی ذات

ریاضؔ جاں میں شگوفے مہک مہک اُٹھے
عطا ہوئی ہے جو آرامِ جان آپؐ کی ذات

زہے قسمت! جو آقاؐ کے فضائل کا شعور آیا
نبیؐ کے عشق کو پا کے بڑا کیف و سرور آیا

وہ جس کو دولتِ ایمان سے رب نے نوازا ہے
شہِ والاؐ کے روضے پہ بہر صورت، ضرور آیا

مقدر میں حضوری ہو، بلاوا ان کا جب آئے
زبانِ دل پکار اُٹھے "حضور آیا، حضور آیا"

نگاہِ اوّلیں میں جب سمویا گنبدِ خضرا
چمک اُٹھا وجود اپنا رگ و ریشہ میں نور آیا

کمالِ فضلِ آقاؐ سے بتِ پندار ٹوٹا ہے
جھکا ہے سر جہالت کا ٹھکانے پر غرور آیا

ریاضؔ نعت نے جنت کی راہیں کھول رکھی ہیں
نہیں خوف و خطر کوئی اگر یوم النشور آیا

دلیزِ مصطفیٰ ﷺ پہ اگر سر جھکا نہیں
دربارِ کبریا سے کوئی واسطہ نہیں
• عرفانِ ذات اس کو میسر نہ ہو سکا
جو آشنائے بارگہِ مصطفیٰ ﷺ نہیں

بہاولپور میں مقیم معروف نعت گو شاعر
عبدالسلام ثمر
کا پہلا نعتیہ مجموعہ
کوثرِ رحمت
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

ناشر:
نستعلیق مطبوعات
F-3 فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور
0423-7351963 / 0300-4489310

عمران نقوی/لاہور

بہارِ عشق نئے معجزے دکھانے لگے مہک گلاب کی شاخِ خزاں سے آنے لگے

نعت گوئی کی تحریک عمران نقوی کے آس پاس اس وقت سے موجود رہی ہے جب شاید اس نے جذبے کو شعر میں ڈھالنے کا فن سیکھا بھی نہیں تھا۔ یہ اس کے گھر کا خاموش ورثہ چلا آتا تھا۔ تا آنکہ ڈاکٹر آفتاب نقوی مرحوم کے قلم نے اسے زبان عطا کی اور اسی کا فیض عمران نقوی کی زبانِ قلم پر جاری ہے۔ عمران کے ہاں نعت محض کارِ ثواب نہیں، واردات اور سرگزشت ہے۔ خوشبو زور کرتی ہے تو منہ بند کلی کو کھلنا ہی پڑتا ہے۔ نسبت کی قوت اور جذبے کا وفور عمران سے نعت کہلواتا ہے۔ یہ وفور اس کے ہاں کس حد تک زور کرتا ہے اس کا کچھ اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس مجموعے میں شامل نوے فیصد نعتیں پے در پے صرف تین ماہ کی مدت میں وارد ہوئیں اور اہلِ ذوق دیکھ سکتے ہیں کہ یہ مشقِ سخن سے نہیں، نقشِ احساس سے عبارت ہیں۔ (ڈاکٹر خورشید رضوی)

بھینی بھینی سی یہ نیاری خوشبو
تیرے ہونے سے ہے ساری خوشبو
دل میں ہے صلِ علیٰ کا موسم
اور سانسوں میں ہے جاری خوشبو
جب بھی خوشبو نے کیا قصدِ سخن
بس ترا نام پکاری خوشبو
پھول مدحت کے کھلائے شب بھر
صبح شاخوں سے اُتاری خوشبو
تیری تعلیم سے مہکے ہم لوگ
ورنہ کب تھی یہ ہماری خوشبو
آ گیا گنبدِ خضرا کا خیال
ہو گئی ذہن پہ طاری خوشبو
تیری راہوں میں گلِ جاں رکھا
تیرے قدموں پہ ہے واری خوشبو
تیری سیرت کے گلابوں سے چنی
اور زمانوں سے گزاری خوشبو

جبلِ نور پہ جب غارِ حرا دیکھتا ہوں
قریۂ سنگ میں اِک پھول کھلا دیکھتا ہوں
ایک خوشبو مری سانسوں میں رواں رہتی ہے
مدحتِ سرورِؐ عالم کا صلہ دیکھتا ہوں
اُن کی رحمت سے ہوں میں اہلِ بقا میں ورنہ
چار سو پھیلا ہوا رنگِ فنا دیکھتا ہوں
زندگی آگ کے رستے کے سوا کچھ بھی نہ تھی
اِک چمن زار سرِ کوہِ صفا دیکھتا ہوں
دونوں عالم ہیں مدینے کے رہینِ احساں
ہر طرف اس کی جھلک، اس کی ادا دیکھتا ہوں
اِک چٹائی ہے سرِ عرشِ بریں ضو افروز
طاقِ افلاک پہ مٹی کا دیا دیکھتا ہوں

بہارِ عشق نئے معجزے دکھانے لگی
مہک گلاب کی شاخِ خزاں سے آنے لگی
یقیں کا رنگ مرے منظروں پہ کھلنے لگا
گماں کی رُت مرے رستوں سے دور جانے لگی
شبوں کا پچھلا پہر جب بھی دل پہ بار ہوا
دُرود پاک کی ضو دھڑکنیں سجانے لگی
میں جب بھی ذات کے جنگل میں دور جا نکلا
تو تیری یاد مجھے راستہ بتانے لگی
درِ قبول جو میرے سخن پہ کھلنے لگا
میں خوش ہوا مری محنت کہیں ٹھکانے لگی
ثنا کے دیپ منڈیروں پہ کیا ہوئے روشن
نسیمِ طیبہ مرے گھر میں آنے جانے لگی

جب سے یہ دل ترے دیار میں ہے
رنگ اور نور کے حصار میں ہے
تیری خوشبو نہیں جو نس نس میں
لطف کیا موسمِ بہار میں ہے
کوئی سورج مری شبوں پہ اُتار
روشنی تیرے اختیار میں ہے
کس کی آواز دل میں ہے روشن
کون اس دشت کے غبار میں ہے
وقت رُک رُک کے سن رہا ہے اسے
ایک آہٹ حرا کے غار میں ہے
اِک جہاں کو تھا انتظار ترا
اک جہاں تیرے انتظار میں ہے

مدحِ سرکارؐ میں گزاری ہے
زندگی اس لیے بھی پیاری ہے
ایک موسم ہے اشکباری کا
اور سب موسموں پہ بھاری ہے
ذکرِ شہؐ میں سخن چھڑا تھا کبھی
اب یہی گفتگو ہماری ہے
سج رہی ہے درود کی محفل
لوگ کہتے ہیں سانس جاری ہے

ابراہیم حسانؔ / حاصل پور

والیل کی آیت تری زلفوں کی ثناخواں　　والشمس ترے چہرے کے انوار پہ شیدا

مشرقی خطے میں شاعری نے سماجی و ثقافتی اثرات مرتب کیے ہیں۔ پاکستان وہ علاقہ ہے جہاں شعراء کی بڑی تعداد نے جنم لیا ہے۔ پاکستان کا گوشہ جنوبی پنجاب بھی گراں قدر سرمائے سے مالا مال ہے۔ بہاولپور کی تحصیل حاصل پور نے بہت سے شاعروں کی آبیاری کی ہے۔ عزیز حاصل پوری، ریاض رحمانی، رشید عثمانی، حسن عباسی اور ابراہیم حسان ایسے نام ہیں جنھوں نے اس خطے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ابراہیم حسان حب نبویؐ کے داعی اور مبلغ ہی نہیں بلکہ نعت کو ایک مذہبی تحریک اور نظام اصلاح و فلاح تصور کرتے ہیں اور سیرت رسول کو منظوم کرنے کے خواہاں بھی ہیں۔ ''نعت'' حسانؓ بن ثابت کے در نعت خوانی سے لے کر عہد حاضر تک لاتی ہے جہاں ہمیں اس در تک رسائی کے لیے مضطرب و بے تاب مسافر راہ ادب ابراہیم حسان بھی نظر آتے ہیں۔ جو زبان و بیان کی طہارت کے ساتھ ساتھ عقیدت کے مصلے پر بیٹھے سرور کائناتؐ کے مدح خواں ہیں۔ عقیدت مندی کے نیک جذبے، عارفانہ علمی کمال، حسن بیان اور اظہار عقیدت ان کو نعتیہ ادبی میدان میں صف اول میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ (عبدالستار فانی)

آمد ہے تری رحمتِ رحمٰن کی بارش
انعام کی، اکرام کی، احسان کی بارش
آقا کی محبت سے جو سرشار ہوا ہے
اُس دل پہ ہوئی دانش و برہان کی بارش
یہ زیست کے راہی کو عطا کرتی ہے منزل
افلاک سے اُتری ہوئی قرآن کی بارش
انسان کے دل کو کیا ایقان سے سیراب
ہر روح پہ ہے آپؐ کے فیضان کی بارش
ہیں آپؐ کے فرمان فصاحت کی گھٹائیں
ہے آپؐ کے اقوال میں الحان کی بارش
کعبے میں بھی اصنام تھے اسلام سے پہلے
آپؐ آئے تو جگ پر ہوئی ایمان کی بارش
ورنہ تھے یہاں چھائے ہوئے جہل کے بادل
آپؐ آئے تو ہونے لگی عرفان کی بارش
ہوں لفظ و تخیل میں عقیدت کی بہاریں
حسانؔ کے اشعار پہ وجدان کی بارش

یٰسین، مدثر کہیں طٰہٰ نظر آیا
قرآن میں سرکارؐ کا جلوہ نظر آیا
سیرت کے مہکتے ہوئے گلشن میں نبیؐ کا
قرآن کی صورت میں سراپا نظر آیا
قرآن کی تفسیر و معانی کے گلوں میں
آقاؐ کا مہکتا ہوا اُسوہ نظر آیا
رحمت کا سحاب آپؐ جہانوں کے لیے ہیں
ہر سمت اُسی ابر کا سایہ نظر آیا
رب آپ اُٹھاتا ہے ترے شہر کی قسمیں
یہ تذکرہ قرآن میں لکھا نظر آیا
سوچوں میں پیمبرؐ کی محبت کو سجا کر
میں نے تو جدھر دیکھا مدینہ نظر آیا
انسان تو تھا وادیٔ ظلمت کا مسافر
آپؐ آئے تو رستوں کو اُجالا نظر آیا
ہیں معجزۂ حق میں ترے اخلاق کے پہلو
ہر پہلو میں اک فیض کا دریا نظر آیا
ہے تیری بلندی ''ورفعنا لک ذکرک''
''نشرح'' میں کشادہ ترا سینہ نظر آیا
آمد پہ تری لرزے تھے کسریٰ کے محلات
ایران کا آتش کدہ بجھتا نظر آیا
ہے مقصدِ بعثت ترا، اخلاق کی تکمیل
ہستی میں تری خلق کا دریا نظر آیا

انس و جاں سے شان آقاؐ کی بیاں ہوتی نہیں
جب تلک ذاتِ الٰہی مہرباں ہوتی نہیں
اُس جگہ جلتا نہیں نورِ بصیرت کا چراغ
روشنی تیری محبت کی جہاں ہوتی نہیں
نامکمل ہے عبادت، ہو کہ ایمان و یقیں
جب تلک تیری محبت حرزِ جاں ہوتی نہیں
ہر گھڑی کرتی ہے رحمت سبز گنبد کا طواف
تیری نگری کے گلستاں میں خزاں ہوتی نہیں
مل نہیں سکتا کبھی حسانؔ منزل کا سراغ
زیست جب تک اُن کے قدموں کا نشاں ہوتی نہیں

ہے فہم و فراست ترے افکار پہ شیدا
تاریخ تری سیرت و کردار پہ شیدا
عرفان تری شان پہ سو بار ہے قربان
وجدان و تصوف ترے اسرار پہ شیدا
ادراک کے نکتے تری سوچوں پہ فدا ہیں
لفظوں کے معانی ترے اسرار پہ شیدا
''مازاغ'' کے الفاظ، حسیں آنکھ پہ صدقے
ہے حسن تمہارا لب و رُخسار پہ شیدا
والیل کی آیت تری زلفوں کی ثناخواں
والشمس ترے چہرے کے انوار پہ شیدا
ہے سیرتِ سرکار ہی قرآن کی تفسیر
آیات کا مفہوم ہے سرکار پہ شیدا

محمد امین ساجد سعیدی / حاصل پور

آیا ابھی ابھی مرے لب پر جو اُن کا نام — بگڑی ہوئی تھی بات بنی ہے ابھی ابھی

محمد امین ساجد سعیدی تحصیل حاصل پور کے معروف نوجوان نعت گو شاعر ہیں۔ ترنم کے ساتھ نعت بھی پڑھتے ہیں۔ حاصل پور کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تقاریب میں اکثر نعت سرا ہوتے ہیں۔ نعت کے علاوہ حمد اور اولیا کرام کی مناقب اور رباعی میں طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی نعتیں پاکستان کے معروف ثنا خوانوں میں محمد شہباز قمر فریدی، منیر حسین ہاشمی، شوکت حسین سعیدی نے پڑھی ہیں۔ امین ساجد سعیدی کا نعتیہ مجموعہ "مدینہ یاد آتا ہے" زیر طبع ہے۔ نعتیہ انتخاب "نستعلیق پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا۔ دوسرا نعتیہ انتخاب "تاجدار عرب وعجم ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ امین ساجد پنجابی میں بھی نعت کہتے ہیں۔ امین ساجد کا اپنے مرشد گرامی غزالی زماں رازی دوراں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی کی مناقبت پر مجموعہ "مرحبا کاظمی" ملتان ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ کاروان نعت لاہور ماہنامہ السعید ملتان، ماہنامہ نور اسلام شرق پور، انوار الفرید ساہیوال، نوید سحر پاسمبرہ، نور الحبیب بصیر پور کے علاوہ قومی اخبارات میں امین ساجد سعیدی کا نعتیہ کلام نظر نواز ہوتا رہتا ہے۔ (ارژنگ)

سکونِ قلب پانے کے لیے میں نعت کہتا ہوں
غموں کو بھول جانے کے لیے میں نعت کہتا ہوں
نبیؐ کے عشق کی مشعل لحد میں کام آئے گی
یہی مشعل جلانے کے لیے میں نعت کہتا ہوں
نہیں اعمال دامن میں ندامت ہی ندامت ہے
ندامت کو مٹانے کے لیے میں نعت کہتا ہوں
عقیدت سے محبت سے چراغاں کرتا رہتا ہوں
تری محفل سجانے کے لیے میں نعت کہتا ہوں
حسینؓ ابن علیؓ کا واسطہ مجھ کو بلا لینا
ترے قدموں میں آنے کے لیے میں نعت کہتا ہوں
ٹلی مشکل پڑھا جب بھی وظیفہ نعت کا میں نے
مصائب کو مٹانے کے لیے میں نعت کہتا ہوں
کسی جادو و منتر سے نہیں کچھ واسطہ مجھ کو
بلاؤں کو بھگانے کے لیے میں نعت کہتا ہوں
ثنا خوانوں میں آ جائے میرا بھی نام محشر میں
یہی اعزاز پانے کے لیے میں نعت کہتا ہوں
ہمیشہ نعت ہو لب پر یہی ہے آرزو ساجد
مقدر کو جگانے کے لیے میں نعت کہتا ہوں

ان کی نظر جو مجھ پہ ہوئی ہے ابھی ابھی
نعت رسولؐ پاک لکھی ہے ابھی ابھی
میری زباں سے نعت کی صورت میں آپؐ نے
غم کی کہانی میری سنی ہے ابھی ابھی
سارے جہاں کے غم میرے دل سے نکل گئے
طیبہ کے ساتھ لو جو لگی ہے ابھی ابھی
آیا ابھی ابھی مرے لب پر جو اُن کا نام
بگڑی ہوئی تھی بات بنی ہے ابھی ابھی
ماحول پل میں نور سے معمور ہو گیا
طیبہ کی یاد دل میں بسی ہے ابھی ابھی
پروانے آ گئے ہیں عقیدت سے وجد میں
نعت نبیؐ کی شمع جلی ہے ابھی ابھی
یہ آپؐ ہی کے جلوؤں کی تصدیق ہو گئی
مخصوص روشنی جو ہوئی ہے ابھی ابھی
آلِ نبیؐ کا ذکر سنا دل کی کائنات
ان کی عقیدتوں سے سجی ہے ابھی ابھی
ساجد امین میں نے پکارا ہے یا نبیؐ
میرے نبیؐ نے میری مدد کی ہے ابھی ابھی

نعت اشکوں سے ترے در پہ سنائیں آقا
ہم بھی سوئی ہوئی تقدیر جگائیں آقا
کام آتی نہیں دنیا کی دوائیں آقا
آپؐ کی دید سے ملتی ہیں شفائیں آقا
ذہن میں کھلتا ہے حسان کا انداز بیاں
جب بھی ہم لب پہ گل نعت سجائیں آقا
آپ کی نعت لبوں پر ہو لحد میں میرے
جب نکیرین مجھے آ کے بلائیں آقا
دل کا گلشن مرا خوشبوؤں سے بھر جاتا ہے
تیرے کوچے سے جب آتی ہیں ہوائیں آقا
اپنے قدموں میں بلایا ہے مدینے مجھ کو
مجھ پہ کیا آپ کی یہ کم ہیں عطائیں آقا
رحمت حق اُنہیں آغوش میں لے لیتی ہے
آپؐ کی آل سے ہیں جن کی وفائیں آقا
نام حسنینؓ کریمین کا جب لیتا ہوں
بھاگ جاتی ہیں زمانے کی بلائیں آقا
اک نظر لطف و عنایت کی ہے درکار مجھے
مجھ پریشاں کو نہ حالات ستائیں آقا
حشر میں حشر نہ ہو جائے کہیں ساجد کا
اس کے دامن میں بہت سی ہیں خطائیں آقا

شازیہ نورین/اٹلی

کہ پنجتن کا قصیدہ مرے کفن سے ملا　　مجال کیا کہ فرشتے کریں سوال کوئی

شازیہ نورین ایک اُبھرتی ہوئی شاعرہ، جس کا تعلق ایک ایسی دھرتی سے ہے جسے عشق ومحبت کی سرزمین اور ساقی کا دیس کہا جاتا ہے۔ انسان جس ماحول اور فضا میں پیدا ہوتا ہے اُس کے اثرات اس کی شخصیت اُس کے دل ودماغ پر لاشعوری طور پر مرتب ہوتے ہیں۔ گجرات کی علمی، ادبی سرزمین شازیہ کو ورثے میں ملی۔ کئی سال سے وہ بیرون ملک میں مقیم ہیں جہاں اُسے اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپے خزانے کھوجنے کا موقع ملا ہے۔ وہ چپ کے سمندر میں جب بھی اُترتی ہے تو لفظوں کے ہیرے جواہرات ساتھ لاتی ہے اوران لفظوں میں شعروں کی مالا کو پرو کر دل آویز بناتی ہے۔ اس کی شاعری میں زندگی سے محبت کا عزم جھلکتا ہے۔ نظم اور غزل کی طرح شازیہ حمد، نعت اور سلام میں بھی منفرد شاعری کرتی ہے۔ اُس کے پہلے شعری مجموعے "فصیل جبر" کے بعد اُس کا سلام ومنقبت پر مشتمل مجموعہ بھی زیر طبع ہے۔ (ڈاکٹر صغریٰ صدف)

گلِ سخن مجھے تطہیر کے چمن سے ملا
کہ جو ملا مجھے دہلیز پنجتنؑ سے ملا
مجال کیا کہ فرشتے کریں سوال کوئی
کہ پنجتن کا قصیدہ مرے کفن سے ملا
مرا نصیب اگر عرش پر پہنچ جائے
کبھی حسینؑ سے مجھ کو کبھی حسنؑ سے ملا
مری زمین ہے کرب وبلا وہیں سے چل
مرے خدا مجھے جلدی مرے وطن سے ملا
اب اپنے در پہ گنہگار کو بلا لیجیے
کہ کچھ نہیں مجھے اس دورِ پُرفتن سے ملا

طوفانِ تند خو میں کنارہ ہے کربلا
بیچارگانِ دہر کا چارہ ہے کربلا
جس میں صداقتوں کے سبق ہیں ورق ورق
تاریخ حق کا ایسا شمارہ ہے کربلا
اس پر نظر پڑی تو نظر خلد پر پڑی
خلد بریں کا ایک نظارہ ہے کربلا
ہر ایک پل پہ حق کی حقیقت عیاں ہوئی
احسان ہر صدی پہ تمہارا ہے کربلا
جس سے شعور وفکر کو تابندگی ملے
ایسا ہی تابناک ستارہ ہے کربلا

تو ہی شریعتوں کی امیں ہے جہان میں
تو نے ہر ایک کفر کو مارا ہے کربلا

آپ کی جو ذات سے ہو آگہی میرے حسینؑ
عطر کو پھر ملتی ہے تابندگی میرے حسینؑ
دین احمد کو جو اُس پل آخری سانسوں پہ تھا
سر کٹا کر پھر سے دی اک زندگی میرے حسینؑ
تھا سر ابن علیؑ جس پل سناں کی نوک پر
رو پڑی تھی بے حسی پر بے حسی میرے حسینؑ
سر تا پا خوں میں نہا کر ریت پر سجدہ کناں
آپ ہی کا ہے کمال بندگی میرے حسینؑ
برسرِ دریا علی کے لال اور تشنہ دہن
اختیاری تھی تری تشنہ لبی میرے حسینؑ
جو شب عاشور پل بھر کو بجھائے تھے چراغ
حشر تک اُن کی رہے گی روشنی میرے حسینؑ
آج پھر درپیش ہے کرب و بلا کا معرکہ
ضبط سے آگے ہوئی ہے بے بسی میرے حسینؑ
اب بھی ہے نسل اُمیہ خوف سے سہمی ہوئی
آپ سے ڈرتا ہے باطل آج بھی میرے حسینؑ
ہے یقیں بن جائے گی میرے لیے وجہ نجات
آپؑ کے در سے مری وابستگی میرے حسینؑ

اے صحنِ ارض بلا تیری نکہتوں کو سلام
خلوص و مہر و وفا کو نفاستوں کو سلام
شفائے خاک ہے؟ خاک شفا ہے؟ تو کیا ہے؟
تو رشکِ خلد ہوئی تیری خوشبوؤں کو سلام
تو وہ زمیں ہے کہ جو فخرِ عرش اعظم ہے
ترے ضمیر کی انمول راحتوں کو سلام
جو تیرے پاس مرا جی اُٹھا قیامت تک
ترے وجودِ بقا کی شہادتوں کو سلام
جہاد کیا ہے بتایا ترے شہیدوں نے
کہے خدا بھی کہ تیرے مجاہدوں کو سلام
وہ راہوار سے اُترا ہے تیرے سینے پر
اے ریگ زار تری پاک سلوٹوں کو سلام
حسینؑ تھے تیرے دامان میں قیام پذیر
زہے نصیب ترے اُن حسیں پلوں کو سلام
ترے محیط میں ٹھہرا ہوا ہے خود خالق
زمین کرب و بلا تیری وسعتوں کو سلام

کیجیے مشکل مری آسان بنتِ مصطفیٰؐ
سخت مشکل میں ہے میری جان بنتِ مصطفیٰؐ
غم کی جلتی دھوپ میں بے کسوں کا سائباں
خلق پہ خالق کا اک احسان بنتِ مصطفیٰؐ

دال دلیا

ظفر اقبال

ماہنامہ ''ارژنگ'' لاہور عامر بن علی اور حسن عباسی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے، البتہ اس کا ماہنامہ ہونا کچھ مشکوک سا ہی ہے کیونکہ یہ ہمیں کبھی کبھار ہی نظر نواز ہوتا ہے، دونوں عزیزان اس پر محنت کرتے ہیں اور اسے دلچسپ بنانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ موجودہ شمارہ جو دسمبر 2012ء کا بتایا گیا ہے، ایک ماہ قبل از وقت شائع ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کا سرورق لاہور آرٹس کونسل کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی سہ روزہ الحمرا قومی ادبی و ثقافتی کانفرنس کے شرکاء کی تصاویر سے مزین ہے جس کے افتتاحی اجلاس کے مہمان خصوصی وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف تھے جبکہ اس کے اندرونی صفحے پر اسی جریدے اور راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام قمر رضا شہزاد کے شعری مجموعے ''یاد دہانی'' کی تقریب رونمائی کی جھلکیاں شائع کی گئی ہیں جو کچھ عرصہ پہلے لودھراں میں برپا کی گئی۔

اس شمارے کے خصوصی مشمولات میں منو بھائی اور ناروے میں مقیم شاعر جمشید مسرور کے انٹرویوز ہیں جو عامر بن علی اور ابرار ندیم نے ریکارڈ کیے، جنہیں باتصویر بھی کہا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں عطاء الحق قاسمی کا شگفتہ مضمون 'شریف خواتین اور غزل' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس کی ابتدا کچھ اس طرح سے ہوتی ہے:

''شاعری میں غزل کی صنف خود ہمیں بری طرح کھٹکا کرتی تھی کیونکہ اس میں خواتین کے حسن و جمال کے تذکرے ہوتے تھے۔ بلکہ غزل کے شاعروں نے تو پردہ دار بیبیوں تک کو بھی نہیں بخشا اور اس طرح کے شعر کہے کہ

داورِ حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

چنانچہ ہم دعا کیا کرتے تھے کہ یا خدا کوئی ایسا بندہ خدا بھیج جو ان شعراء کا ''کھوج'' مٹھپے۔ سو خدا نے ہماری سن لی اور اصغر بن ابراہیم نامی ایک شخص کو یہ توفیق دی کہ وہ ساری کلاسیکی اور آج کی غزل پر جھاڑو پھیریں اور یوں شاعری کے صحن کی صفائی کریں۔ ہم نے ان صاحب کا مضمون ''شریف خواتین تغزل کی غلط روش کے خلاف آواز اٹھائیں'' کے عنوان سے آج ہی ایک اخبار میں پڑھا ہے۔ موصوف نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ بلاشبہ غزل دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ کیونکہ یہ اسی تغزل کا نتیجہ ہے کہ عورتیں اپنی تعریف سننے کے لئے بے پردگی کی طرف مائل ہو رہی ہیں۔ چنانچہ اصغر بن ابراہیم صاحب نے نیک سیرت عورتوں کا دینی فریضہ یہ بتایا ہے کہ وہ تغزل کی اس غلط روش کے خلاف آواز اٹھائیں، موصوف کے اس نقطہ نظر سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ چونکہ انہیں خود غزل کہنا نہیں آتا لہٰذا انہوں نے تمام شاعروں کے لئے اسے حرام قرار دے دیا ہے۔''

اس کے علاوہ افتخار مجاز نے اپنے دلچسپ مضمون ''ہائے او زہا'' میں عطاء الحق قاسمی ہی کے حوالے سے رقم کیا ہے کہ ایک صاحب بکرا منڈی میں عید قربان کے موقع پر بکرا لینے جاتے ہیں۔ ایک بیوپاری انہیں ایک دبلا پتلا، کمزور، نحیف اور مریل سا دنبہ دکھاتا ہے۔ اس پر خریدار بیوپاری سے پوچھتا ہے کہ کیا یہ اصلی دنبہ ہے یا تم نے اسے مار مار کر دنبہ بنا دیا ہے؟ اس کے علاوہ قاسمی صاحب نے بتایا کہ انہوں نے عہد ضیاء الحق ہی میں بکرا عید پر ایک ڈرامہ ٹیلی ویژن والوں کے لئے ان کی درخواست پر لکھا۔ دوسرے روز ٹیلی ویژن کا پروڈیوسر ان کا لکھا ہوا ڈرامہ سکرپٹ واپس لے کر آ گیا کہ یہ 'آن ایئر' نہیں جا سکتا۔ وجہ پوچھی تو موصوف نے بتایا کہ آپ نے اس میں قربانی کے بکروں کے جس حلیے کا ذکر کیا ہے اس میں کئی جگہ مذکور ہے کہ بکروں کی سیاہ آنکھیں سرمے سے معمور ہیں۔ صدر ضیاء الحق کی آنکھیں بھی سیاہ ہیں اور وہ بھی سرمہ لگاتے ہیں۔ لہٰذا واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ بکروں کی مماثلت ضیاء الحق سے قرار دی جا رہی ہے' یا یہ تشبیہ صدر ضیاء الحق کی طرف واضح اشارہ دیتی ہے۔

اس شمارے میں متعدد مضامین اور دو افسانوں کے علاوہ شعری گوشے ہیں جن میں بسمل صابری، ضمیر طالب، نیلما ناہید درانی، قمر رضا شہزاد، شاہین عباس، عرفانہ امر، سعید الظفر صدیقی، نزہت عباسی، حسنین سحر، اشفاق ناصر، سید مقبول حسین، قیصر مسعود، ارشد نذیر ساحل، اقبال طارق، احمد عطاء اللہ، یاسمین جاوید رضی اور شازیہ نورین کا کلام شامل کیا گیا ہے۔ ان میں سے چیدہ چیدہ اشعار:

میں جانتا ہوں اسے، وہ بھی میرے جیسا ہے
وہ توڑ دے گا مجھے موڑتے ہوئے آخر
میں ننگے پاؤں بہت دیر گھومتا رہا ہوں
تمہارے شہر کی مٹی میں ہے اثر میرا
(ضمیر طالب)

کوئی دیوار گراتا نہیں میں
راستہ خود ہی بناتا نہیں میں
کون ہے میرے تعاقب میں یہاں
کس لئے پاؤں اٹھاتا نہیں میں
توڑتا رہتا ہوں خود کو شہزاد
اور پھر کچھ بھی بناتا نہیں میں
میرے خیال میں اتنی بری نہیں دنیا
یہ ہر کوئی اسے جتنا برا سمجھتا ہے
بھٹکنے والوں سے ہوتی ہے طے مسافت عشق
جو بے خبر ہے وہی راستہ سمجھتا ہے
یہ جو مجھ کو گرا دیا گیا ہے
آپ کو راستہ دیا گیا ہے
(قمر رضا شہزاد)

ہم نے توہین کی، قیام کیا
اس سفر میں قیام تھا ہی نہیں
اب میں نہیں راہ میں تو رستہ
میری جگہ خاک اڑا رہا ہے
شب ہجر جیسی رواں تھی، ویسی رواں رہی
میں کوئی بھی لہر ادھر ادھر نہیں کر سکا
(شاہین عباسی)

ہجر انساں کے خدوخال بدل دیتا ہے
کبھی فرصت میں مجھے دیکھنے آنا، مرے دوست
ایک کاسہ تھا جسے توڑ دیا ہے میں نے
اک چٹائی ہے جو صحرا میں بچھائی ہوئی ہے
(اشفاق ناصر)

وہ پہلی محبت تھی عطا پہلی محبت
اور راس ہمیں دوسری آئی بھی نہیں تھی
میں ڈھونڈنے نکلا تھا بھرے شہر میں جس کو
اس کی تو کوئی خاص نشانی بھی نہیں تھی
لوگوں میں تھی رائج ابھی تحفوں کی روایت
شہروں میں ابھی اتنی گرانی بھی نہیں تھی
(احمد عطا اللہ)

چھکھڑ سبھے منظر ٹھکے

(پوٹھوہاری غزلیں، نظمیں)

شاعر: شکور احسن

قیمت: -/120 روپے

ناشر: مضراب، گوجر خان

0346-5756591

ہماری چند مطبوعات

فیض احمد فیض تنقیدی مطالعہ

انتخاب: ڈاکٹر طاہر تونسوی
عہد ساز شاعر فیض کے فکر و فن پر
نامور سکالرز کے مضامین
قیمت: -/400 روپے

رقصِ ابلیس (ناول)

ایم اسلم کا شہرہ آفاق ناول
انقلاب 1947ء کی ایک خونچکاں داستان
معروف نقاد حسن عسکری کی گراں قدر آراء
قیمت: -/300 روپے

مقالاتِ اقبال

عبدالواحد معینی
علامہ اقبال کے اردو مقالات اور
عہد انگریزی مضامین کے اردو تراجم کا مجموعہ
قیمت: -/300 روپے

سکون کی راہیں

ڈاکٹر شمیم الحق
ڈپریشن، ٹینشن، خوف، بے یقینی، وہم
وسوسے جیسے مسائل کے اسباب اور تدارک
ایک مکمل گائیڈ
قیمت: -/250 روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، لاہور

تقسیم کار: مکتبہ تعمیر انسانیت

اردو بازار، لاہور

عطاء الحق قاسمی اور ان کا فن

خورشید رضوی

خواتین و حضرات!

ہر چند کہ آپ کو بخوبی اس بات کا علم ہے مگر پھر بھی آپ کو یہ اطلاع دینے میں کیا مضائقہ ہے کہ آج کی یہ محفل مجلس فروغ اردو ادب' قطر کے سالانہ ادبی ایوارڈ کے سلسلے میں منعقد کی گئی ہے جو اس بار پاکستان سے معروف شاعر، ادیب، صحافی اور کالم نگار جناب عطاء الحق قاسمی کے حصے میں آیا ہے۔ جناب عطاء الحق قاسمی کو اس سے قبل بھی بہت سے ایوارڈ مل چکے ہیں مثلاً پاکستان کے صدارتی ایوارڈ ستارہ امتیاز اور پرائڈ آف پرفارمنس بھارت کا ''رشید احمد صدیقی ادبی ایوارڈ'' رائٹرز گلڈ کا آدم جی ایوارڈ اور بہترین کالم نویس کا ایوارڈ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اب ان کی کلغی میں کوئی نیا پر سجانے کی گنجائش اسی وقت نکل سکتی ہے جب وہ 'از روئے انکسار' اسے شرف قبولیت بخشنے کے لئے عارضی طور پر' دو ایک پرانے پر نکال کر رکھ دینا گوارا کریں۔ اس اعتبار سے مجلس فروغ اردو ادب کے ساتھ ہم سب کو بھی قاسمی صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس تازہ اعزاز کو پذیرائی کا اعزاز عطا کرتے ہوئے آج کی محفل کو رونق بخشی۔

جناب عطاء الحق کی طبیعت کے عناصر' جو چار سے زیادہ ہیں' غیر معمولی تنوع میں گندھے ہوئے ہیں۔ وہ ایک دینی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ دنیا انہوں نے خوب چل پھر کر دیکھی ہے۔ اساس مضبوط ہے اور بازو کشادہ۔ دل محیط گریہ اور لب آشنائے خندہ ہے۔ شعر و ادب سے صحافت تک اور ادارت سے سفارت تک ہر میدان میں جھنڈے گاڑ چکے ہیں اور خوبی یہ ہے کہ ان کے کارنامے پٹی کی طرح ان کی آنکھوں پر بندھے ہوئے نہیں بلکہ گردِ سفر کی طرح ان کے پیچھے اڑتے نظر آتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ انہیں اپنی کرسی سے بڑا پایا اور زندگی کے نرم و گرم مراحل میں ان کی فطری بے ساختگی میں کبھی فرق آتے نہیں دیکھا۔

خواتین و حضرات! مجھے جناب عطاء الحق قاسمی سے کسی دیرینہ قرب کا دعویٰ نہیں لیکن اپنی طبعی فراخدلی اور وسیع المشربی کے باعث چونکہ وہ کسی سے بھی دشمنی رکھنے کے اہل نہیں اس لئے میں بھی خود کو ان کے دوستوں میں شمار کر سکتا ہوں۔

قاسمی صاحب کی طبیعت کی گونا گونی کا ذکر ہو چکا۔ یہی گونا گونی ان کے نتائج قلم میں بھی ظہور کرتی ہے۔ لکھتے لکھتے اب وہ اس مقام پر آ چکے ہیں جہاں وہ اپنے ممدوح ابوالاثر حفیظ جالندھری کے شعر میں تصرف کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ:

تشکیل و تکمیل فن میں جو بھی عطاؔ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

خواتین و حضرات! عطاء الحق صاحب نے خوبصورت شاعری بھی کی ہے۔ بالعموم یہ تقریب اعزاز سالانہ مشاعرہ سے قبل ہوا کرتی ہے اور میرا ارادہ تھا کہ میں ان کے مجموعہ کلام ''ملاقاتیں ادھوری ہیں'' سے چند منتخب اشعار بھی آپ کو سناتا لیکن اب غالباً اس کی ضرورت نہیں رہی' کیونکہ آپ گذشتہ شب کے مشاعرے میں کلام شاعر بزبان شاعر کی لذت سے بہرہ یاب ہو چکے ہیں' تاہم ان کی کہی ہوئی نعت کا ایک شعر مجھے اس وقت بے ساختہ یاد آ رہا ہے اور میں یہ شعر آپ کو سنائے بغیر آگے نہیں چل سکتا۔

تو نے تو کچھ بھی دیکھنے نہ دیا
اے مری چشم تر مدینے میں

شاعری سے کالم نگاری تک اور سفر نامے سے ٹی۔ وی ڈرامے تک ایک دھنک ہے جو عطاء الحق قاسمی کے قلم سے پھوٹتی رہی اور اس دھنک سے پھوٹنے والی ہر کرن اپنی برجستگی، شگفتگی، صفائی اور بے ساختگی کے ساتھ سیدھی دلوں میں ترازو ہوتی رہی۔ مگر آج ہمیں ان کی ذات کے سب دریچوں پر دستک نہیں دینی۔ فروغ اردو ادب ایوارڈ' جناب عطاء الحق کو طنز و مزاح کے میدان میں دیا گیا ہے اس لئے آج ہم خود کو اسی گوشے تک محدود رکھنے کی کوشش کریں گے۔

طنز و مزاح کی بات جب بھی چھڑتی ہے مجھے ایک قول زریں یاد آتا ہے۔ ''قبل از طعام طنز' بعد از طعام مزاح''۔ قاسمی صاحب کے ہاں سیر چشمی کچھ ایسی ہے کہ گرسنگی کی نوبت کم کم ہی آتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ گو بعد از دوپہر کے خشمگیں لمحات میں گاہے گاہے وہ نشتر طنز بھی آزما لیتے ہیں مگر غلبہ پھولوں کی طرح کھلتے ہوئے مزاح کا ہی رہتا ہے جس میں زہر خند کے بجائے خند مکرر کی شیرینی ہوتی

ہے۔

مزاح نگاری کوئی مذاق نہیں۔تنی ہوئی رسی پر چلنے کا نام ہے۔ذرا پاؤں اوچھا پڑا اور مزاح ابتذال میں تبدیل ہوا۔پڑھنے والوں کے ہونٹوں پر تبسم بکھیرنے کے لئے مزاح نگار کو بہت سا خون جگر صرف کرنا پڑتا ہے۔اعلیٰ درجے کے مزاح کی تہ میں آنسوؤں کا نمک گھلا ہوا ہوتا ہے۔ظرافت کا کوئی نسخہ نہیں جسے پڑیا میں باندھا جا سکے۔محض لطیفوں کی مالا پرونے سے اچھا مزاح وجود میں نہیں آ سکتا۔الغرض ظرافت کا کوئی طریقہ نہیں بس ایک سلیقہ ہے۔جسے عطا ہو گیا عطا ہو گیا۔اور یہ سلیقہ ہمارے آج کے ممدوح کو مبدء فیاض سے خوب خوب ارزانی ہوا ہے۔بے محل نہ ہوگا اگر اس موقع پر ان کے مزاح کی تھوڑی تھوڑی شیرینی حاضرین محفل میں تقسیم کر دی جائے۔انجم رومانی صاحب کے خاکے میں لکھتے ہیں:

''اندازہ لگائیں کہ جو شخص ۱۹۳۷ء میں بھی بہت عمدہ شعر کہتا ہو وہ اپنا شعری مجموعہ' قریباً نصف صدی بعد' ۱۹۸۳ء میں شائع کرواتا ہے۔حالانکہ اُن کی جگہ اگر آج کی عجلت پسند مصنفین کا کوئی رکن ہوتا تو ۱۷ برس کی عمر میں شاعری شروع کرنے کے بعد ۲۰ برس کی عمر میں اس کے کلیات بھی شائع ہو چکے ہوتے۔ایک عجلت پسند مصنف نے اپنے دوست سے کہا: ''یار اب تم اپنا شعری مجموعہ شائع کروا ہی ڈالو''۔دوست نے جواب دیا: ''ابھی تو میرے پاس اتنی غزلیں ہی نہیں ہیں'' عجلت پسند مصنف نے کہا: ''غزلیں تم بعد میں کہتے رہنا' پہلے مجموعہ تو چھپواؤ''

اسی خاکے میں قاسمی صاحب آگے چل کر کہتے ہیں:

''انجم صاحب ہر وقت مترنم لہجے میں ہولے ہولے کھانستے رہتے ہیں۔جب وہ کھانس رہے ہوں تو ایسے لگتا ہے کہ ایک ''ردھم'' کے ساتھ چاندی کے ورق کوٹے جا رہے ہیں۔انجم صاحب کی یہ کھانسی ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے مشاعروں میں بھی دکھائی اور سنائی دیتی ہے۔منیر نیازی کی بدگمانی کے مطابق انجم صاحب کو یہ کھانسی کسی شاعر کے اچھے شعر پر چھڑتی ہے۔''

عطاء الحق قاسمی مزاح لکھتے ہی نہیں بولتے بھی ہیں جس کا گواہ ہر وہ شخص ہے جس نے چند گھڑیاں ان کی صحبت میں بسر کی ہیں۔میرے بیٹے کے ولیمے میں آئے تو میں نے محسوس کیا کہ حضرت کا تن و توش کچھ زیادہ ہی مائل بہ افزونی ہے۔اس حوالے سے میرے اور ان کے مابین پنجابی میں ایک مختصر سا مکالمہ ہوا۔میں نے کہا:

''عطا بھائی! اینتے ای بھاری ہو گئے او۔کجھ واک شاک کر یا کرو''

انہوں نے اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا: ''آہو جی! پر ذرا ہولے ہولے ہوئے تے واک کریئے''

مختصر سا یہ ایک جملہ ان کے مزاح کی شگفتگی اور کاٹ دونوں کا آئینہ دار ہے۔آپ پہلے اس پر کھلکھلا کر ہنستے ہیں مگر ہنسی کے دوران ہی اس کا سنجیدہ عمق آپ پر کھلنا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ یہ جملہ انسانی زندگی کے ایک بنیادی Paradox کا آئینہ دار ہے۔

عطاء الحق قاسمی کا مزاح تبسم ریز ہی نہیں ،فکر انگیز اور نتیجہ خیز بھی ہوتا ہے۔یہ فن شاید انہوں نے مولانا روم سے سیکھا ہے۔مولانا اپنی مثنوی میں جا بجا کوئی دل چسپ حکایت چھیڑ دیتے ہیں جسے قارئین ہنستے کھلتے پڑھتے چلے جاتے ہیں۔مگر آخر میں جا کر مولانا ایسا چونکا دینے والا نتیجہ برآمد کرتے ہیں جس کی طرف حکایت کے دوران میں خیال منتقل نہیں ہوتا۔مثال کے طور پر بنیے کے طوطے کی کہانی جسے اس نے خوب باتیں کرنا سکھا رکھا تھا۔ایک روز بنیے کی غیر موجودگی میں ایک بلی چوہے پر لپکی۔طوطا بیچارہ اپنی جان کے خوف سے اودھر اودھر پھڑ پھڑاتا پھرا اور اضطراری طور پر تیل کی بوتلوں سے جا ٹکرایا جن کے اوندھنے سے ساری دوکان میں تیل بہنے لگا۔بنیے نے آ کر دیکھا تو اسے طوطے کی بدمستی پر محمول کیا اور ایک چھڑی اس کے سر پر ایسی ماری کہ اس کے بال جھڑ گئے اور وہ گنجا ہو گیا۔اس دن سے طوطے نے بولنا بند کر دیا۔(میرے ایک ڈاکٹر دوست کی غلط تشخیص کے مطابق چھڑی کی ضرب سے طوطے کا سپیچ سنٹر تباہ ہو گیا تھا) بنیے کو طوطے کے چپ ہو جانے کا بہت قلق ہوا۔اپنے کیے پر نادم ہوتا اور عالم تاسف میں اپنے بال نوچتا رہا۔بہت تدبیریں کیں کہ وہ طوطئ خوش نوا کسی صورت پھر زبان کھولے مگر اسے نہ بولنا تھا نہ بولا۔آخر ایک روز ایک گنجا فقیر دوکان کے آگے سے گزرا جسے دیکھتے ہی طوطا بے ساختہ بول اٹھا:

تو مگر از شیشہ روغن ریختی

''شاید تو نے بھی کسی بوتل سے تیل گرایا ہے''

اب یہ سنیے کہ مولانا روم اس کہانی سے نتیجہ کیا نکالتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ دنیا دار لوگ خاصان خدا کے معاملات کو اسی طرح خود اپنے اوپر قیاس کر

لیتے ہیں جو بہت بڑی غلطی ہے۔اور پھر اس نتیجے سے مولانا روم یہ درس برآمد کرتے ہیں:

کار پاکاں راقیاس ازخود مگیر
گرچہ ماند در نبشتن شیر و شیر

''پاک لوگوں کے معاملات کو اپنی ذات پر قیاس نہ کر لیا کرو کہ لکھنے میں اگرچہ ''شیر'' اور ''شِیر'' ایک سے ہوتے ہیں (مگر دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے)

عطاء الحق قاسمی پیر رومی کے مرید باصفا معلوم ہوتے ہیں سو اسی اسلوب سے کام لیتے ہیں۔میری زندگی کے بائیس طویل سال سرگودھا میں گزرے ہیں۔چنانچہ جب میں نے ان کی تحریروں میں ''بھاگٹانوالہ ایرپورٹ'' کا عنوان دیکھا تو یاد ماضی نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔''بھاگٹانوالہ'' سرگودھا کا ایک نواحی مقام ہے جہاں ایک زمانے میں لاہور اور سرگودھا کے درمیان شروع ہونے والی چند روزہ ایئر سروس کے لئے یہ نام نہاد ''ایئرپورٹ'' بنایا گیا تھا۔اس سروس میں پرواز کا تجربہ میں خود تو نہیں کر سکا مگر قاسمی صاحب کی تحریر نے اس کے ظاہر و باطن پر ایسی کامل روشنی ڈالی ہے کہ خود سفر کرنے سے بھی شاید میسر نہ آسکتی۔اللہ اللہ یہ جہاز جو ''ٹوئن لوٹر'' کے نام سے موسوم تھا کیا جہاز تھا بقول قاسمی صاحب:

''جب رن وے پر کھڑے دیوہیکل جہازوں کے پاس سے گزرتے ہوئے پی آئی اے کی بس نے ایک جہاز نما چیز کے پاس اتارا تو اسے دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی۔یوں لگتا تھا جیسے جہاز کے بچے نکلوائے گئے ہوں۔یہ جہاز ویگن سے بڑا نہیں تھا اور بھیگی بلی کی مانند یوں سر جھکائے کھڑا تھا جیسے اپنی جسامت پر خود بھی شرمندہ ہو''

لطف یہ تھا کہ اس جہاز میں' جو کل چودہ نشستوں پر مشتمل تھا' کسی مسافر کی کوئی مقررہ نشست نہیں بتائی جاتی تھی۔بلکہ عملے کا ایک فرد جہاز کا توازن برقرار رکھنے کے لئے' مسافروں کو شطرنج کے مہروں کی طرح' جس خانے میں مناسب سمجھتا' اٹھاتا بٹھاتا تھا۔ایک مسافر کے تبصرے کے مطابق اس جہاز کی ایک پسندیدہ ادا یہ بھی تھی کہ اس کی پرواز دوسرے جہازوں کی نسبت بہت نیچی تھی اور یہ جہاز فضاء میں پرواز کرتے ہوئے بھی زمین سے اپنا رشتہ برقرار رکھتا تھا۔بہرحال یہ جہاز اپنے مسافروں کو لے کر بحفاظت بھاگٹانوالہ ایئرپورٹ پر جا اترا۔

خواتین و حضرات! یہاں تک کا بیان تو ''ٹوئن لوٹر'' کی ہیئت کذائی اور کارکردگی کی ماہرانہ تصویر کشی پر مشتمل تھا جس پر لکھنے والا یقیناً داد کا مستحق ہے۔مگر اب اس سے آگے اچانک مولانا روم نمودار ہوتے ہیں اور عطاء الحق قاسمی کا ہاتھ پکڑ کر کچھ لکھواتے ہیں اور اسی اختتامیے کے لیے میں نے آپ کو ''بھاگٹانوالہ ایئرپورٹ'' کی قرات میں شریک کیا ہے۔ساری بے کسی اور خستہ حالی کے باوجود جب یہ جہاز اپنے مسافروں کو لے کر بحفاظت ایئرپورٹ پر جا اترتا ہے تو رخصت ہوتے ہوئے' عطاء الحق اپنے ایک ہم سفر سے جو راستے بھر ان سے دل چسپ باتیں کرتا چلا آیا تھا' یوں مکالمہ کرتے ہیں:

''آپ سے مل کر مجھے حقیقتاً بہت خوشی ہوئی اگر آپ نہ ہوتے تو میرا سارا سفر سہمے ہوئے گزرتا کیونکہ جہاز کی حالت بہت ڈرا دینے والی تھی''

''ڈرا دینے والی حالت تو ہمارے ملک کی بھی ہے'' مسافر نے الوداع کہتے ہوئے خوش دلی سے کہا ''اسی جہاز کی طرح چھوٹا سا' خدشات سے بھرا ہوا اور محدود وسائل کا حامل ملک' مگر اس اس کے مستقبل سے مایوس نہ ہوں۔بس حفاظتی اقدامات ملحوظ رکھیں۔اور ہاں یہ واحد پرواز ہے جس کا رشتہ زمین اور آسمان دونوں سے برقرار ہے۔خدا آپ کا حامی و ناصر ہو''

خواتین و حضرات! عطاء الحق قاسمی صاحب نے اپنی طرز نگارش کا ایک اصول یہ بیان کیا ہے کہ ''میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ مضمون سات آٹھ منٹ سے زیادہ نہ ہو'' کوئی اور سیانا بھی کہہ گیا ہے Brevity is the soul of wit ''اختصار ظرافت کی جان ہے'' میں چونکہ ظرافت نگار نہیں ہوں اس لئے جان ظرافت کا خیال رکھنا میرے فرائض منصبی میں شامل نہیں۔مگر پھر بھی یہ خیال دل پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ میری یہ ژولیدہ سی تحریر اپنی طوالت کے سبب' کہیں خود میرے ممدوح کی خاطر عاطر پر بار نہ ہو جائے۔چنانچہ میں اپنے قلم کے ''ٹوئن لوٹر'' کو لینڈنگ کے رخ پر لاتا ہوں۔خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔کرسی کی پشت سیدھی رکھیے۔تھوڑی سی دیر میں ہم اتر جائیں گے۔مگر اترنے سے پہلے ایک آخری بات۔جناب عطاء الحق قاسمی کی کتابوں پر ایک جملہ درج ہوتا ہے۔''ہنستی مسکراتی' دل میں درد جگاتی تحریریں''۔جب قاسمی صاحب سٹیج پر تشریف لائیں تو ان سے ان کا مختصر سا کالم ''الہ دین کے جن کا زوال'' سنانے کی ضرور فرمائش کیجیے۔اس پر انتظار حسین صاحب جیسے بڑے افسانہ نگار کا تبصرہ یہ تھا کہ یہ تو ایک افسانہ ہے۔اس کالم کو سن کر آپ کو ادراک ہو سکے گا کہ ہنستی مسکراتی تحریریں دل میں درد کیونکر جگا سکتی ہیں۔

پروین شاکر۔ایک باصلاحیت اور خوش قسمت شاعرہ

زیب النساء زیبی/کراچی

پروین شاکر 42 برس کی عمر میں اردو ادب کو اپنی لازوال شاعری کا ورثہ عطا کر کے ہم سے جدا ہو گئیں۔25 سال کی عمر میں ان کا پہلا مجموعہ 'خوشبو' شائع ہوا پھر تین برس بعد 'صد برگ' اور پھر پانچ پانچ برس کے وقفے سے 'خود کلامی' اور 'انکار' سامنے آیا۔1994ء میں 'ماہِ تمام' کے نام سے کلیات سامنے آ گئی۔پروین شاکر نے 1968ء میں محسن اعظم محسن ملیح آبادی کی شاگردی اختیار کی اور پھر بعد میں احمد ندیم قاسمی سے کسب فیض لیا۔

پروین شاکر سے میرا تعلق ایک شاعرہ کی حیثیت سے تھا۔میں نے ان کے ساتھ مشاعرے بھی پڑھے۔جب وہ کسٹم آفس میں تھیں ان سے ملاقات بھی ہوئی میری بڑی بہن مہرالنساء سرسید کالج کی طالبہ تھیں۔پروین شاکر ان کی ہی کالج فیلو تھیں۔وہاں بھی ان سے ملاقات رہی۔پھر میری بڑی بہن سوشل ویلفیر آفیسر کی حیثیت سے آئی اسپنسر اسپتال میں تعینات کی گئیں جہاں پروین کے شوہر ڈاکٹر نصیر احمد سے بھی اپنی بہن کے توسط سے انہیں دیکھنے کا موقع ملا۔

پروین کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔وہ ایک جاذب نظر شخصیت کی حامل تھی۔ان کی آنکھوں میں زندگی کے وہ تمام عکس تھے جنہیں ان کے مشاہدے اور تجربے نے سمیٹ کر اپنی پلکوں تلے چھپا لیا تھا۔ان میں فکر کی گہرائیاں تھیں۔کرب،دعائیں،نمی،انتظار،ہجر،تنہائی،مسافت اور تلاش و جستجو تھی۔ان کی شخصیت کا تمام بحران کے کلام میں جابجا نظر آتا ہے۔

میں جگنوؤں کی طرح رات بھر کا چاند ہوئی
ذرا سی دھوپ نکل آئی اور ماند ہوئی
پانی دیکھا،نہ زمیں دیکھی،نہ موسم دیکھا
بے ثمر ہونے کا الزام شجر پر رکھا

ان کے غزل کے تین شعر اور ملاحظہ کیجیے:

آراستہ تو خیر، نہ تھی زندگی کبھی
پر تجھ سے قبل،اتنی پریشان بھی نہ تھی
آنے میں گھر مرے،تجھے جتنی جھجک رہی
اس درجہ تو میں،بے سروسامان بھی نہ تھی
جس جاکمین بنے کے دیکھے تھے میں نے خواب
اس گھر میں،ایک شام کی مہمان بھی نہ تھی

پروین شاکر اس لحاظ سے بھی خوش قسمت تھیں کہ انہیں اپنی خداداد صلاحیتوں کو منوانے کے لئے ریڈیو سے روزنامہ جنگ اور فنون تک کے سفر میں یاور مہدی،طاہر شاہ،نثار احمد زبیری،عبیداللہ علیم اور احمد ندیم قاسمی جیسی رہنما شخصیات کی توجہ اور شفقت آمیز کرم فرمائیاں حاصل رہیں۔لیکن اس میں قطعاً شک نہیں کہ پروین انتہائی ذہین،ایک بالغ العقل،ہوشمند،زیرک،تخلیقی قوتوں سے مالا مال منفرد خیالات اور مضبوط ہمت و حوصلے والی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیںان انگریزی،اردو،فارسی،عربی اور فرنچ سے واقفیت تھی۔

پروین شاکر خود''کہانی میری''میں یاور مہدی کا اظہار تشکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ جس ہاتھ نے میری آواز کی قامتوں کو سراہا اس کا نام یاور مہدی ہے میں نے اور یاور مہدی نے رفاقت کے ان سات برسوں میں کئی موسم دیکھے۔میری نمو میں آواز کی دنیا کا بڑا ہاتھ ہے۔اپنی شادابیوں کے لئے میں اس فضا کی شکر گزار ہوں۔

پروین شاکر کا پہلا پروگرام 1968ء میں نشر ہوا۔پروین نے یاور مہدی کے ساتھ تقریباً دو ڈھائی سو پروگرام کیے۔جس میں مذاکرے، مشاعرے،تنقیدی نشستیں اور اسکرپٹ رائٹر کی خدمات شامل ہیں۔ریڈیو کے حوالے سے ہی وہ ملک کی نامور ادبی شخصیات سے متعارف ہوئیں اور یہیں سے ان پر شہرت،مقبولیت اور اعتماد کے در وا ہوئے۔پروین شاکر کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ان کے نانا سید حسین عسکری اور والد سید شاکر حسین ثاقب بھی شعر کہتے تھے۔یہاں میں پروین شاکر کی زندگی کا ایک اور واقعہ بھی بیان کرنا چاہوں گی۔یہ فروری 1969ء کا واقعہ ہے۔

پاکستان اسٹوڈنٹس گلڈ نے مرزا غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر کل پاکستان تحریری شعری مقابلہ منعقد کیا جس کا مصرعہ طرح تھا'' کہتے ہیں

کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور" اس مقابلے میں سو غزلوں میں سے چالیس غزلیں منتخب کی گئیں۔ جج صاحبان میں رئیس امروہوی زیڈ اے بخاری، بزم انصاری، سید ہاشم رضا اور سراج الدین ظفر تھے۔ اس میں پہلا انعام حاصل کرنے والی طالبہ کینٹ پبلک گرلز کالج کوہاٹ کی ثریا رضا تھیں۔ پانچویں نمبر پر پروین شاکر جامعہ کراچی تھیں۔ وہ تقسیم انعامات کی تقریب میں اپنا انعام بھی لینے نہیں آئیں۔ بظاہر محسوس ہوتا تھا کہ پروین شاکر ججوں کے فیصلے سے ناخوش تھیں گو کہ یہ فیصلہ خالصتاً میرٹ پر تھا۔ پروین نے کہا کہ میں اول آنے والی غزل دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ انہیں دکھائی گئی اس پر انہوں نے خوب داد دی اور یہ بات واضح ہوگئی کہ پروین جج صاحبان کے فیصلے سے ناخوش نہیں تھیں۔ یہاں میں دونوں غزلیں ناظرین کی نذر کرنا چاہوں گی۔

ہوگی نہ عمارت کوئی پھر تاج محل سی
ممتاز تو ہیں، ہوگا نہ اب، شاہجہاں اور
دل میں ہو اگر عشق تو ہوتی ہے زباں بند
اظہار محبت پہ گزرتا ہے گماں اور
زاہد کو عبث زعم ہے سجدے کے نشاں پر
دل جس سے چمک جائے وہ ہوتا ہے نشاں اور
تھا ناز ثریا کو بہت اپنی فغاں پر
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور
(ثریا رضا)

یہ درد محبت ہے کبھی کم نہیں ہوتا
جتنی بھی دوا کیجیے ہوتا ہے جواں اور
دیکھے تو کوئی حوصلہ، اس سوختہ جاں کا
جل کر بھی پکارے ہے کہ ہاں برق تپاں اور
گھبرا نہ میری شدت فریاد سے ہم دم
دیتی ہے دم آخر شب، شمع دھواں اور
یوں تو غم جاں، درد جہاں، سب ہیں میسر
جو تیری عنایت ہے وہ ہے، درد نہاں اور
(پروین شاکر)

ازدواجی زندگی کی ناکامی نے پروین کو اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا اور یہ تمام کرب ان کی شاعری کا حصہ بنا۔ وہ کہتی ہیں:

کمال شخص تھا جس نے مجھے تباہ کیا
خلاف اس کے یہ دل ہو سکا، اب بھی نہیں
یہ دکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی ہم نے
ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

انہوں نے پوری سچائی سے نسائی جذبات کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ وہ عورت کی باطنی کیفیات کے زیر و بم کو صداقتوں کے حوالے کرنے کے ہنر سے واقف تھیں۔ وہ ایک ایسی عورت کی جھلک پیش کرتی ہیں جو عشق میں پاکبازی کی ردا سر پر رکھے اپنا سماجی سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔

دھنک دھنک میری پوروں کو خواب کر دے گا
وہ لمس میرے بدن کو گلاب کر دے گا
قبائے جسم کے ہر تار سے گزرتا ہوا
کرن کا پیار مجھے آفتاب کر دے گا
میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا
تم موج موج مثل صبا گھومتے رہو
کٹ جائیں میری سوچ کے پر، تم کو اس سے کیا
اوروں کا ہاتھ تھامو انہیں راستہ دکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر تم کو اس سے کیا

پروین کا کلام پے در پے شکست کی جراحتوں کے ملال کا قصہ سناتا ہے۔ جس میں حوا کی بیٹی کی مظلومیت کا قصہ ہے، عدم تحفظ کا قصہ ہے، جبر ہے، سنگدل معاشرے کی بے حسی کا تذکرہ ہے۔

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو
کھیلنے والے سب ہاتھوں کو میں گڑیا ہی لگتی ہوں
جو پہنا دو مجھ پہ سجے گا
میرا کوئی رنگ نہیں ہے
جس بچے کے ہاتھ تھما دو
مری کسی سے جنگ نہیں ہے
اور پھر جب دل بھر جائے تو
دل سے اٹھا کہ طاق پہ رکھ دو
تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو

پروین شاکر کا زیادہ تر کلام نثری نظموں پر مشتمل ہے جو موضوعاتی اور فکری لحاظ سے دیگر شعراء کے کلام سے منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔ ان کی نظمیں چاند رات، واہمہ ہنی مون، شرط، پذیرائی، رفاقت، اعتراف، کنیادان، تاج محل، ورکنگ وومن، اونٹ کا حافظہ رکھنے والے، مقدر، بشیرے کی گھر والی، صرف ایک لڑکی، ایک بری عورت وغیرہ میرے اس بیان کی دلیل ہیں۔

پروین کے ہاں صرف نسائی شاعری کا بیج ہی نہیں ملتا بلکہ اس میں عالمگیر مسائل کا تذکرہ بھی ہے، انسانی تمناؤں کے مدفن بھی ہیں اور حریت فکر کے پہلو بھی ہیں۔ ان کی ایک نظم بہت دل چاہتا ہے ملاحظہ کیجیے۔

مگر تم نے حد کر دی
نہ بیت المال ہی چھوڑا
نہ بیوہ کی جمع پونجی

اور اب تم نے
ہماری سوچ کو بھی
راجدھانی کا کوئی حصہ بنانے کا ارادہ کر لیا ہے
ہمارے خواب کی عصمت پہ نظریں ہیں
قلم کا چھیننا آساں نہیں ہے

پروین شاکر کی شاعری میں کہیں کہیں جنس آشنا عورت کا عکس بھی نمایاں ملتا ہے گو کہ ایسی کیفیات کے بیان میں فہمیدہ ریاض نے بہت جرأت کا مظاہرہ کیا۔ محبت، جنس اور زندگی کا آپس میں گہرا ناتہ ہے اور کوئی بھی حساس فرد ایسی کیفیات اور جذبات سے خود کو الگ نہیں رکھ سکتا اور عورت تو پیدا ہی ہوئی ہے چاہے جانے کے لئے اور جب اس پر پذیرائی اور سرشاری کے موسم جھوم کر آئیں تو اس کی شخصیت کے دلکش رنگ خود بخود اظہار بیان میں ڈھل جاتے ہیں۔ پروین نے بھی ایسے مواقع پر کہیں کہیں اشارات اور کہیں کہیں حیا کی ردا میں پنہاں ہو کر نسائی جذبات کے اظہار کو زبان عطا کی ہے۔

آج کل زمانے کو کچھ کھٹک سی رہتی ہے
کچھ دنوں تعلق میں احتیاط ہو جائے
میں اس کی دسترس میں ہوں، مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

پروین شاکر کی ایک غزل جو مہدی حسن نے گائی ملاحظہ ہو:

کو بکو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی
وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو میرے پاس آیا
اک یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی
کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے، مگر بات ہے رسوائی کی

پروین کی شاعری تنوع، دلکشی اور ہمہ گیریت کی شاعری ہے جس نے مجموعی طور پر پورے ایک عہد کو متاثر کیا۔

جان کیٹس کی طرح پروین شاکر نے بھی انتہائی کم عمری میں اچانک ہی رخت سفر باندھا اور پل کے پل میں جہان فانی سے روانہ ہو گئیں اور ادب کا ایک درخشندہ باب ادھورا ہی چھوڑ گئیں۔

میں نے فقط کہا تھا، بتا، زندگی ہے کیا
سن کر چراغ اس کا بجھانا عجیب تھا

تاثرات

سجاد میر پروین کے کلام پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پروین شاکر نے اپنے اردگرد پھیلے ہوئے انتشار اور بکھراؤ سے حسن کا جو پیکر تراشا ہے وہ ایک پھول بن کر سامنے آیا۔ پروین ایک عورت کی طرح دکھ سہنا جانتی ہے اور سچائی کے ساتھ وہی لکھنا چاہتی ہے جو محسوس کرتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی: پروین جذبے کی شدت اور شائستگی کی شاعرہ ہے۔ جذبے کا سچا، کھرا اور خوبصورت اظہار اس کی شاعری کا کرشمہ ہے۔ نہ وہ اپنے آپ کو فریب دیتی ہے اور نہ اپنے قاری سے کچھ چھپاتی ہے۔ اس نے محبت کے جذبے کی حیرت انگیز تہذیب کی ہے۔ پروین نے اس پامال موضوع کو رفعت بخشی ہے اور اس کی قدامت کو جدت میں بدل دیا ہے۔ اردو شاعری میں یہ ہر لحاظ سے ایک نئی آواز ہے۔ منفرد، جمیلا در مستقبل گیر آواز۔

فہمیدہ ریاض: پروین کے شعروں میں لوک گیتوں کی سی گمبھیر سادگی اور لے بھی ہے۔ کلاسیکی موسیقی کی نفاست اور نزاکت بھی۔ ان کی تروتازہ نظمیں ان پھولوں کی طرح ہیں جن پر باغبان نے برسوں کی ریاضت کی ہو۔

امجد اسلام امجد کہتے ہیں کہ پروین شاکر کی شاعری سچے نسائی محسوسات اور جذبوں کی شاعری ہے۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی خوبصورت، نرم و نازک فوارے کی طرح ابھرتی اور پھیلتی ہوئی شاعری کے ذریعے اردو کے شعری اسالیب میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کہتے ہیں پروین کی بیشتر نظمیں اس کی اپنی ذات، اس کے محبوب اور اس کی پھیلی ہوئی کائنات کا مطالعہ، تذکرہ اور صحیفہ ہیں۔ ان نظموں میں بے حد پھیلاؤ اور بیحد ارتکاز ہے۔ یہ یکجائی آپ کو آسانی سے کسی اور جدید فنکار کے ہاں نہیں ملے گی۔

ممتاز مفتی کہتے ہیں پروین کی شخصیت کے تین پرت ہیں۔ پہلی پرت دیکھو تو لطافت ہے۔ لے ہے معصومیت ہے اور حیا کے جال ہی جال۔ دوسری پرت ذہنی پختگی، مردانہ جرأت اور ظالمانہ حقیقت۔ تیسری پرت پیش منظر اور پس منظر ہے۔ دکھ کی ایک بے نام بھیگ جو ساری شخصیت میں لہریں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ پروین کی پرنم شخصیت کو دیکھ کر لگتا ہے کہ جیسے دکھ کے پانیوں میں گھرا ایک سرسبز جزیرہ ہو۔

ڈاکٹر نیر صمدانی کہتے ہیں پروین نے فاتح اور مفتوح کے خود ساختہ سے ماورا ہو کر اپنے جذبات کو پیش کیا ہے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے عورت اپنے اعزازی مقام سے نیچے نہیں آتی بلکہ وہ عشق کی منزلت کو آگے بڑھاتی ہے۔

اشفاق احمد ورک: پروین شاکر پہلی خاتون شاعرہ ہیں جن کے ہاں عورت اور شاعرہ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہے۔ پروین کو زبان پر پوری گرفت حاصل ہے۔

منٹو۔ سیاسی مورّخ

ثمینہ سید

زندگی کے منظر نامے پر ایک نظر ڈالیں تو رنگ برنگی تصویریں بکھری پڑی ہیں۔ کچھ واضح بہت صاف اور کچھ دھندلی سی ہیں، ہر کوئی حسب توفیق اور حسب اوقات ان میں اپنا حصہ ڈالتا جاتا ہے۔ بسنے والے انسانوں کی اس بستی میں کسی ڈاکٹر، انجینئر، حکیم، سائنسدان، استاد، شاعر، ادیب، اور نجانے کن کن ناموں سے پکارتے جاتے ہیں پھر ہر ایک مزید کلاسیفیکیشن ہوتی جاتی ہے۔ اصل، نقل، عقلمند، کم عقل، بکاؤ، باحیا، نقال اور نجانے کن کن قسموں میں انسانوں اور ان کی صلاحیتوں کو بانٹتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سارے رویے 'معاشرہ' ہیں۔ کوئی بھی ان کی زد سے بچ کر اپنی مرضی سے جی سکتا ہے نہ اپنے آپ کو اپنی مرضی کا مقام دے سکتا ہے۔

پھر ہر معاشرے کا اپنا ایک مخصوص نقطہ نظر ہوتا ہے۔ اپنی تہذیب، اپنی اقدار اور اپنی ہی حدود ہوتی ہیں۔ وہ اس آئینے میں ہر فرد کی شخصیت کا معیار مقرر کرتا ہے۔

میں بھی اپنی ناقص رائے کے مطابق یا پھر ایسے کہہ لیں کہ اپنی بساط سے بڑھ کر اپنے ایک آزاد اور خود مختار فرد ہونے کی حیثیت سے منٹو کو اپنا سیاسی مورخ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں نے یہ مضمون لکھنے کے لئے اور اپنی اس رائے کو مزید مستحکم ہوتے پایا جب منٹو کے افسانے اور اس پر لکھے گئے مضامین کا مطالعہ کیا۔

منٹو جس عہد میں جیتے تھے، سانس لے رہے تھے اسے وجدانی جمالیاتی یا انفرادی نقطہ نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ یقیناً وہ اسی فطرت پر پیدا ہوئے تھے۔ وہ اس سے منحرف ہو کر حسن و عشق میں کھو کر نہیں جی سکتے ہوں گے۔ وہ وقت کو سرسری نظر سے دیکھ کر خوش رنگ کہانیاں نہیں لکھ سکتے ہوں گے تو نہیں لکھیں۔ ان کا تعلق بالواسطہ طور پر ایک مخصوص نظام زندگی معیشت اور نظام معاشرت سے ہے۔ وہ صاف الفاظ میں اس کا اظہار کرتے ہوئے کہتا تھا۔

''زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دراصل وہ موجودہ نظام کا نقص ہے۔

منٹو نے اپنے مقام کا خود تعین کر لیا تھا وہ خود کو ترقی پسند ادیب کہتا تھا۔ ذرا دیکھیے منٹو کے اپنے خیالات۔

'شرر کے ناول اور راشد الخیری کے قصے آج کل کے اکثر مصنفین کو بالکل بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھنے والوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ مارکیٹ میں چلے جائیں۔ آج سے دس بیس برس پہلے کے لکھنے والوں کی کتابیں اسٹالوں پر بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کی کتابیں، ایم اسلم، تیرتھ رام فیروز پوری، سید امتیاز علی تاج اور عابد علی عابد کی کتابوں کے مقابلے میں زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ کرشن چندر اور اس کے ہم عصر نوجوانوں نے زندگی کے نئے تجربات پیش کئے ہیں۔

منٹو کو اکثر حلقوں میں طوائفوں، دلالوں اور جنسی حرکات کا تانا بانا بننے والا افسانہ نگار تصور کیا جاتا ہے اور اس طرح کی شہرت کی وجہ سے لڑکے اور لڑکیاں یعنی نوجوان نسل منٹو کے افسانے چھپ چھپ کر خاص دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور یہی منٹو کی کامیابی ہے۔ منٹو کی پوری فنی زندگی جنس نگاری اور فحاشی کے الزام سے آج تک بری نہیں ہو سکی، لیکن منٹو کی پوری زندگی کو اس دائرے میں محدود کر دینا بھی زیادتی ہے۔ وہ اپنے عہد کا ترجمان تھا۔ ہر طرح کے حالات کو اس طرح اپنے خیالات اور الفاظ میں بنا کہ ہر منظر کا چشم دید گواہ بن گیا۔ ہر کردار کا دکھ اور احساسات کو خود پر طاری کر کے انتہائی تکلیف میں رہا۔

منٹو کی شخصیت او فنی سفر کو تین طبقات میں تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ قدامت پرست جو منٹو پر کیچڑ اچھالنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے رہے ہیں۔ تو دانشوروں اور مفکرین کو منٹو کی تحریروں میں دانشوری ار فکری انضباط کا فقدان ملتا ہے۔ اور حکمران اسے کمیونسٹ سمجھتے تھے۔ جو اس دور میں گالی سمجھی جاتی تھی۔

اس بات کا ذکر منٹو اپنی کتاب ''لذت سنگ'' میں تفصیل سے کرتا ہے۔ منٹو کے افسانوں پر تعزیری کارروائیاں کی گئیں۔ جو منٹو کے اعصاب

پر ناخوشگوار اثرات ضرور چھوڑتی مگر اسے ہراساں نہ کر پاتیں۔ اردو زبان میں کئی ادیب جنس پرستی پر افسانے لکھ رہے تھے تو آخر منٹو اور عصمت ہی کیوں قانون کی گرفت میں لیے جاتے رہے؟ اس فرق کے عقب میں حکمرانوں کی گہری سوچ اور حکمت عملی کارفرما تھی۔ حسن عسکری ور ممتاز مفتی جنس نگاری کر رہے تھے؟ حسن عسکری بنیادی طور پر مغرب کی 'جدیدیت' سے متاثر تھے اس تحریک کے زیر اثر انہوں نے خود کو فرد کے نفسیاتی اور جنسی مسائل تک محدود کر رکھا تھا، جبکہ ممتاز مفتی صرف جنسی نفسیات پر مبنی افسانے لکھ رہے تھے، ان کے افسانوں میں حکومت کا ذکر تھا، نہ تعرض۔

حسن عسکری، ممتاز مفتی اور دیگر جنس نگار ادیب جن میں عزیز احمد بھی شامل تھے۔ انہوں نے صرف 'حرامجادی'، چائے کی پیالی'، اندھا'، آپا' یہ دیوی' جیسی کہانیاں ہی لکھیں لیکن منٹو نے دھواں، بلاؤز، کالی شلوار، خونی تھوکا ور بو جیسے افسانے لکھ کر خود کو عہد کا چشم دید گواہ ثابت کیا۔

منٹو نے قاری کو اس زمانے اور اپنے معاشرے سے آگاہی دی وہ قاری کو ہاتھ سے پکڑ کر لے جاتا، اور 'وہاں' کھڑا کر دیتا۔ جو منٹو دیکھتا وہ قاری کو بھی صاف نظر آ رہا ہوتا۔ وہ اس معاشرے کے نظام معاشرت اور نظام سیاست کی ناہمواریوں اور پیچیدگیوں، الجھنوں اور سازشوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ پاتا ہے۔ آج بھی قاری جنسیت کا مزہ بھول کر اس عہد کے رویوں میں کھو جاتا ہے۔

قاری، موذیل، پڑھتے ہوئے، موذیل جو مرکزی کردار ہے جو کئی مردوں کے بستر گرم چکی ہے۔ روز نیا عاشق بدلتی ہے، جو بے وفا اور بدعہد عورت ہے۔ اسے یاد نہیں رکھ پاتا۔ قاری کو یاد رہتا ہے تو وہ زمانہ، وہ قتل و غارت گری، مظلوم ہندو اور مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل، سرعام قتل برطانوی عہد کی گری ہوئی ذہنیت اور موذیل کی ہمدردی اور وفاداری منٹو صرف جنسیت پرست نہیں تھا وہ نا ہی فرائڈ کا پیروکار تھا۔

بلکہ وہ معاشرے کے منفی رویوں اور تخریبی عوامل کو بیان کرتا ہے۔

بدترین قسم کے مادی اور معاشرتی جبر میں ہمدردی اور انسان دوستی کی مثالیں نکال لاتا ہے۔ وہ معاشرے کی ابنارملٹی کا عکاس ہے۔

جنسی فعل اور شہوانی حسیات منٹو کا مطمع نظر ہی نہ تھا وہ تو ایک سنگدل ماحول، ازکاررفتہ اخلاق اور انسان کی بے بسی میں خالصتاً انسانی اقدار سے بھرپور کہانیاں لکھ رہا تھا۔ اس کے کردار منہ زور تھے، منافق نہیں تھے۔ منٹو خود پر ہونے والے مقدمات اور تکلیف دہ معاملات کا تذکرہ کچھ اس طرح کرتا ہے۔

'اس اندھی روح، گنجے فرشتوں اور پنجاب کے طلاء فروش اخبار والوں اور رسالوں کے مالکوں اور ان کے مریض ایڈیٹروں کی بدولت ایک بار پھر مجھے لاہور کی اس عدالت میں حاضر ہونا پڑا جسے جگت کے طور پر ضلع کہتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں کی ضبطی اور اس کی گرفتاری کا مطالبہ کرنے والے وہی اخبار تھے، جو بعد میں یہ چھاپتے تھے۔

لاہور کے ایک رسوائے عالم رسالے میں جو فحاشی و بے ہودگی کی اشاعت کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ ایک افسانہ شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان 'بو' اس کے مصنف ہیں مسٹر سعادت حسن منٹو۔ اس افسانے میں عیسائی لڑکیوں کا کیریکٹر اس درجہ گندہ ہے کہ کوئی شہری برداشت نہیں کر سکتا' (ہفتہ وار خیام۔ لاہور)

اسی طرح ہفتہ وار لاہور، آئینہ، بمبئی اور اخوت نے حکومت سے نا صرف منٹو کو بلکہ لطیف لاہور کے پبلشرز اور پریس کے مالک تک فوراً گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ ایسے سیاسی حالات تھے جب منٹو کا یہ افسانہ 'بو' اور اس کے ساتھ شائع ہونے والا مضمون برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت تھی۔ اس کی جنگی کوششوں اور تسلط میں روڑے اٹکانے کے مترادف تھا۔

1944ء میں یہ افسانہ شائع ہوا اور اس پر الزامات کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ اور دوسری طرف ترقی پسندوں میں اشتراکی اور آزاد منش عناصر تھے۔ جو منٹو کے رویے سے اتفاق کرتے تھے اس کا ثبوت 'قومی جنگ' بمبئی کی 4 فروری 1945ء کی اشاعت میں چھپنے والے علی سردار جعفری کے ایک مضمون سے ملتا ہے۔ یہ مضمون 'ادب اور تہذیب پر حملہ ہے' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں پہلے منٹو اور عصمت کو اردو کے بہترین افسانہ نگار قرار دیا گیا تھا اور ان کی عتاب زدہ کتابوں 'دھواں اور چوٹیں' کے حوالے سے یہ لکھا گیا تھا۔

'اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں 2 فروری کو عصمت کی پیشی ہونے والی ہے۔ لیکن عدالتی کارروائی سے پہلے ہی ان دونوں پر بہت کچھ گزر گئی۔

'منٹو کے افسانے' 'دھواں' اور 'کالی شلوار' جو سیشن کورٹ سے فحاشی کے الزام سے باعزت بری ہوئے تھے پھر زیر عتاب آ گئے۔ ان پر تعزیرات ہند 294 کے تحت دوسری بار پھر مقدمہ ہوا منٹو کو 5 دسمبر 1944ء کو بغیر کسی وارنٹ کے گرفتار کر لیا گیا۔ احمد ندیم قاسمی گرفتاری سے چند مہینے پہلے ہی منٹو کو ایک خط لکھ کر بتا چکے تھے کہ 29 مارچ 1944ء کو ادب لطیف کا سالنامہ ضبط کر لیا گیا ہے۔ یہ ضبطی منٹو کے افسانے 'بو' اور 'ادب

جدید' کی وجہ سے ہوئی۔ اس کے بعد منٹو پر فحاشی کے ساتھ ساتھ سیاسی الزامات بھی لگنے لگے۔ منٹو حکمرانوں، سیاستدانوں اور ایوان والوں کی نظروں میں کھلنے لگے۔ جیلوں بہانوں سے منٹو کی جیل میں حاضریاں ہونے لگیں۔ ادب لطیف کی ضبطی کے بعد 'دھواں' اور 'کالی شلوار' پر دوبارہ مقدمہ ہوا اور دوبارہ گرفتاری بھی کی گئی۔

ان معرکوں کے پیچھے ارباب اختیار کا خوف تھا۔ منٹو کے بارے میں بے بنیاد اور مضحکہ خیز سیاسی تاثرات اور تعصبات تھے۔ جو امرتسر اور بمبئی کے گلی کوچوں میں بازگشت کرتے رہتے۔ حکومت منٹو کو کمیونسٹ ثابت کرنا چاہتی تھی تا کہ اسے عوام الناس میں ناپسندیدہ قرار دلوایا جا سکے۔ اس کا اظہار خود منٹو نے اپنے افسانے ''دو گڑھے'' میں اس طرح کیا۔ ''مجھے آپ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں اور عدالتیں ایک فحش نگار کی حیثیت سے۔ حکومت مجھے کبھی کمیونسٹ کہتی ہے اور کبھی ملک کا بڑا ادیب، کبھی میرے لئے روزی کے دروازے بند کئے جاتے ہیں اور کبھی کھولے جاتے ہیں۔''

منٹو کے افسانوں میں سیاست برائے سیاست کہیں نہیں ملتی، وہ ایک لہر کی طرح ہے۔ جو دوسرے کئی طوفانی جذبوں کے ساتھ ساتھ اٹھتی بیٹھتی نظر آتی ہے۔ سیاسی موضوعات پر براہ راست گفتگو کرنا منٹو کا فنی مسلک نہیں تھا۔ بس افسانوں میں سیاسی موضوعات کی فکر اور موجودگی کو منٹو کے ہاں جس نرالے ڈھنگ سے پرویا گیا وہ صرف اسی کا خاص وصف ہے۔ وہ سیاست میں ملوث نہیں تھا۔ نہ اس کا حلقہ احباب سیاست دانوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر وہ خود کو عصری و سیاسی رجحانات سے الگ بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ سیاسی معاملات پر گہری نظر رکھنے والا تھا۔ انسان دوست ادیب تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ 'نیا قانون' 'کھول دو' 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اور 'چچا سام کے نام خطوط' نہ لکھتا۔

منٹو حساس اور حقیقت نگار ادیب تھا۔ منٹو ایک شخصیت کا نام ہے۔ بلاشبہ وہ ایک عہد کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جب ہم اسے دیکھتے ہیں تو ہمیں 'دھواں' اور 'بلاؤز' لکھنے والا منٹو اگلے دور میں 'نیا قانون'، موذیل اور موتری لکھنے والا نظر آتا ہے۔ مگر بدلتا وقت منٹو کو 'بابو گوپی ناتھ'، سیاہ حاشیے، ٹھنڈا گوشت اور کھول دو' لکھنے پر مجبور کر دیتا ہے جب اسی رنگ میں ذرا اور شدت آئی ہے اور 'کالی شلوار' اور 'ہتک' لکھے جاتے ہیں۔

منٹو معاشرتی حقیقت نگاری اور مغرب کے رویوں کے زیر اثر ایک پورا معاشرہ تھا۔ ایک شخص نہیں تھا۔ منٹو کے افسانوں میں سیاست بے شک فسادات کے حوالے سے آئی لیکن وہ سیاسی رویوں کا ترجمان ضرور تھا۔

منٹو کے افسانے بیانیہ ہیں اور اکثر چبھتے ہوئے جملے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی رویوں کی چغلی کھاتے ہیں، جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے پر لکھے گئے افسانے میں منٹو لکھتے ہیں۔ 'آہ موت بھیانک ہے، مگر ظلم اس سے کہیں زیادہ خوفناک اور بھیانک ہے۔'

منٹو برطانوی تسلط میں پسنے والوں کے دکھوں کو زبان دیتے تھے۔ 'نیا قانون' میں ایک جگہ لکھتے ہیں آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں، ناک میں دم کر رکھا ہے، ان بندروں کی اولاد نے۔' ذرا دیکھیے منٹو نے چچا سام کے نام جو خطوط لکھے اس کو ایک بار گہری نظر سے دیکھیے وہ منٹو کے اندر بیٹھے سیاستدان اور دانشور کی سوچ ہم پر واضح کر دیتے ہیں۔

منٹو کی سیاسی ہمدردیاں کس کے ساتھ تھیں۔ یہ بھی چھپا نہیں رہتا، چچا سام کے نام خطوط سے کچھ اقتباسات نقل کرتی ہوں منٹو کو سیاسی مورخ ثابت کرنے کے لئے کافی ہوگا۔

'میں غریب ہوں اس لئے کہ میرا ملک غریب ہے، مجھے تو پھر دو وقت کی روٹی کسی نہ کسی حیلے بہانے سے مل جاتی ہے۔ مگر میرے بھائی ایسے بھی ہیں جنہیں یہ بھی نصیب نہیں ہوتی۔''

'میرا ملک غریب ہے، جاہل ہے کیوں؟ یہ آپ کو تو بخوبی معلوم ہے چچا جان۔ یہ آپ کے اور بھائی جان بل کے مشترکہ ساز کا ایسا تار ہے۔ جسے میں چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ آپ کی سماعت پر گراں گزرے گا۔'

'آپ پاکستان سے فوجی امداد کا معاہدہ ضرور کریں گے اس لئے کہ آپ کو اس دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے استحکام کی بہت زیادہ فکر ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ یہاں کا ملا، روس کے کمیونزم کا بہترین توڑ ہے۔ فوجی امداد کا سلسلہ شروع ہو گیا تو آپ سب سے پہلے ملاؤں کو مسلح کیجیے گا۔ ان کے لئے خالص امریکی ڈھیلے لباس، خالص امریکی تسبیحیں اور خالص امریکی جائے نمازیں روانہ کیجیے گا۔

استروں اور قینچیوں کو سرفہرست رکھئے گا۔

منٹو نا صرف اپنے عہد کا ادیب تھا بلکہ وہ تو ہر عہد کا ادیب ہے۔ منٹو سیاسی مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ آئندہ کے حالات کی پیش گوئیاں بھی کر گیا۔ کیسا بالغ نظر اور باشعور سیاست دان تھا منٹو کے اندر جو ایک مزدور کی طرح حالات کی بھٹی میں جل کر کندن ہو گیا تھا۔ جس کی مضطرب روح اگر صرف اپنا ہی درد محسوس کر سکتی تو پھر وہ آفاقی ادب کیسے تخلیق کرتا؟

ڈاکٹر صغرا صدف کا ''وعدہ''

حسن عباسی

''وعدہ'' ڈاکٹر صغرا صدف کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ کتاب کے سرورق پر حنوط شدہ نیلی تتلی کی تصویر ہے اور بیک ٹائٹل پر ویسی ہی تصویر ڈاکٹر صغرا صدف کی ہے۔ نیلے آنچل میں گندھی ہوئی حنوط شدہ نیلی تتلی کی طرح جیسے کوئی ڈری سہی سہی سی ''لڑکی'' دریچے سے جھانک رہی ہو۔ نیلا رنگ گہرے دُکھ اور اذیت کی علامت ہے۔ یہاں مجھے اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

دریچے سے جھانکتی وہ لڑکی عجیب دُکھ سے بھری ہوئی ہے
کہ اس کے آنگن میں پھول پر ایک نیلی تتلی مری ہوئی ہے

یہ نیلے رنگ کا ٹائٹل، نیلی حنوط شدہ تتلی اور اس نیلے رنگ میں رنگی ہوئی صغرا صدف کی تصویر اپنے اندر گہری معنویت لیے ہوئے ہے۔ دُکھ، اذیت اور کرب کی ایسی کیفیت ہے جو پوری شاعری میں پھیلی ہوئی ہے۔ بالکل ویسی کیفیت جو ڈاکٹر صاحبہ کی ذات کے اندر نہاں ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کی شاعری پہلے بھی میں نے پڑھی ہے مگر ان کے تازہ شعری مجموعے کو ایک سے زائد بار پڑھنے کا موقع ملا اور ہر بار نئے ذائقے اور نئی کیفیت سے میں گزرا۔ ابتداء میں سب ہی شاعر شوقیہ شاعری کرتے ہیں یا قافیہ اور ردیف کے زیرِ اثر غزل کہتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ فن پر ان کی دسترس اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ قافیہ ردیف شاعر کی ذات کا حصہ بن جاتے ہیں اور وہ اپنے اندر کی مکمل کیفیات سپردِ قرطاس کرنے کے ہنر سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس شعری مجموعے میں ڈاکٹر صاحبہ نے شاعری کے ذریعے اپنی زندگی اور ذات کا ایک ایک دکھ اور کرب اس طرح پرویا ہے کہ قاری اس کی حدت اور شدت سے بچ نہیں سکتا۔

انسانی رویوں کے حوالے سے میں جن ادیبوں سے متاثر ہوا ہوں اُن میں ڈاکٹر صاحبہ کی شخصیت بھی ہے۔ بیس برس کی ادبی رفاقت میں ہمیشہ میں نے ان کو ایک شفیق اور مہربان دوست ہی پایا۔ اعلیٰ خاندانی روایات کی امین ہیں۔ بے شمار شعراء کو ادبی منظرنامے پر لانے میں ان کا بڑا خاموش کردار ہے۔ احسان کر کے نہ جتلانا اور دشمن کو معاف کر دینا ان کی دو ایسی خوبیاں ہیں جنہوں نے مجھے اور بھی ان کے قریب کر دیا۔ ڈاکٹر صاحبہ کے حوالے سے لکھتے ہوئے یادوں کے بہت سے دریچے ہیں کہ کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ بیس برس پہلے کے واقعات کل کی بات لگتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ڈاکٹر صاحبہ سے میری پہلی ملاقات خالد علیم صاحب کے دفتر اُردو بازار میں ہوئی تھی۔ اُس وقت اُن کی شخصیت سے متعلق پہلا تاثر جو قائم ہوا وہ یہ تھا کہ وہ انتہائی سادہ، مخلص اور محبت کرنے والی خاتون ہیں اور آج بھی ایسا ہی ہے۔ ہماری قربت کی بڑی وجہ ہمارا Self made ہونا بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ، میں اور میرے چند اور دوست جنہوں نے لاہور میں آ کر بہت کشٹ کاٹا بڑی محنت کی۔ انہیں کامیابی خیرات میں نہیں ملی بلکہ اس کے پیچھے برسوں کی محنت اور ریاضت شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ زیادہ کامیاب ہوئیں۔ انہوں نے تعلیمی میدان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پنجابی اور اُردو کے حوالے سے بطور شاعر، کمپیئر، کالم نویس اور محقق کے اپنے آپ کو منوایا۔ ایک ادبی سرکاری ادارے کی ڈائریکٹر ہیں۔ FM ریڈیو کے ایک چینل کی اسٹیشن ڈائریکٹر ہیں۔ ملک اور بیرونِ ملک بے شمار عالمی مشاعروں میں شرکت کر چکی ہیں۔ بہت سے ایوارڈ اُن کو ان کے فن کے اعتراف میں دیے جا چکے ہیں۔ گویا وہ تمام کامیابیاں انہوں نے لاہور آ کر سمیٹی ہیں جن کے پیچھے ہماری بہت سی شاعرات دیکھتے دیکھتے اپنے بال سفید کر بیٹھتی ہیں۔ اس سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈاکٹر صاحبہ نے پوری ادبی دنیا میں اپنی ایک پہچان بنائی ہے اور اُن کا نام نہایت محبت اور ادب سے لیا جاتا ہے اور کیوں نہ لیا جائے کہ انہوں نے ہمیشہ شاعروں ادیبوں کو عزت دی ہے۔ مجھے بھی بیرونِ ملک اُن کے ساتھ مشاعروں کی غرض سے سفر کا موقع ملا۔ ہمیشہ انہوں نے بہن کی طرح خیال رکھا اور جتنی آسانیاں اور سہولتیں پیدا کر سکتی تھیں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ انسانیت سے محبت کے درس میں تصوف کی راہ پر چل پڑی ہیں اور ایک ''درویشی'' کا روپ رنگ اُن پر غالب آ رہا ہے اور یہی رنگ اُن کی غزلوں اور نظموں سے بھی جھلکتا ہے۔ یہ غزل دیکھیے:

تاریخ کے دیار میں اک میں ہوں ایک تو
اور دونوں ہر مقام پہ موضوعِ گفتگو
تو ہے شکنتلا کہ کہیں انتظار میں
اور میں ہوں کالی داس کے خوابوں کی آبرو
تو بو نواس کوئی، روزینہ کے ہاتھ میں
خیام کی رباعی سے میری ہوئی نمو

تو ما دھو لال کا کوئی نازل شدہ جمال
میں ہیر شہر عرش کی مجھ سے کلام ہو
عورت ہوں میں، قلم مرا چاہت کے واسطے
پروین کی تمنا ہوں سفو کی جستجو
یادوں کے رتھ پہ بیٹھ کے شہر خیال میں
کرتا ہے کوئی صفرا صدف تیری آرزو

اس طرح کے کتنے ہی خوبصورت اشعار کی کہکشاں ڈاکٹر صفرا صدف کے تازہ شعری مجموعہ میں بکھری ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہیں۔ ان کی صلاحیتوں کے جوہر مختلف اصناف میں کھلتے رہتے ہیں۔ اُمید ہے مستقبل میں تصوف کے حوالے سے اُن کا کوئی بڑا کام منظر عام پر آئے گا۔ میں ڈاکٹر صاحبہ کی نہ صرف شاعری کا معترف ہوں بلکہ میرے لیے وہ ایک آئیڈیل شخصیت بھی ہیں۔ جاتے جاتے اُن کی ایک اور غزل پڑھئے اور سر دُھنیے:

اپنا سکے اُسے نہ کبھی دل کی بات کی
یہ زندگانی ہم نے بسر جس کے سات کی
لگتا ہے تیری آنکھ ہے میرے وجود میں
رکھتی ہے جو خبر مری اک ایک بات کی
بے خواب موسموں میں لٹا قافلہ مرا
اپنے ہی لکھ رہے تھے کہانی یہ مات کی
اُلجھی ہوئی سی پھرتی ہے کچھ دن سے یہ ہوا
دیکھی ہے وحشت اس نے ابھی ایک رات کی
دشوار ہے جدائی تو مشکل ہے ہمرہی
طے کس طرح کروں میں مسافت حیات کی
آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ چرا لے گیا مجھے
تفصیل کیا بیان ہو اس واردات کی
جس کی رضا کو اپنی رضا جانتی رہی
اس نے نفی ہی کی ہے صدف میری ذات کی

زمانے میں جدھر جاؤ مجھے سب تیرا کہتے ہیں
خوشی سے میں نہ مر جاؤں مجھے سب تیرا کہتے ہیں

معروف شاعر اور متعدد شعری انتخابوں کے مرتب خاور نعیم بٹ کا
ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے نہایت منفرد اور رومانوی شعری انتخاب

مجھے سب تیرا کہتے ہیں

اعلیٰ گیٹ اپ میں شائع ہو گیا ہے

ملنے کا پتہ: K.N.B پبلشرز، الحمد مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
0301- 4424924 0344-4424944

ویلنٹائن ڈے اسپیشل نوجوان شاعرہ نایاب سحر کا مرتب کردہ رومانوی شعری انتخاب

مری سانسوں میں تم ہو

نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ اس انتخاب میں نوجوان شعراء کی مقبولِ عام غزل اور نظموں کے علاوہ سینئر اور کلاسیکل شعراء کا شاہکار کلام بھی شامل ہے

ملنے کا پتہ: K.N.B پبلشرز، الحمد مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
0301- 4424924 0344-4424944

بچپن سہانا
شاعر: اعجاز فیروز اعجاز
بچوں کی نظمیں قیمت: 200 روپے
ناشر: نگاہ پبلی کیشنز
ایف ایف 5، بلاک 6 ٹائپ سی، پی ایچ اے کالونی
نزد اک موریہ پل مصری شاہ، لاہور

تمہاری یاد کا موسم
نوجوان شاعرہ مصباح نازش کا
دوسرا شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے
قیمت: -/150 روپے
ناشر: نستعلیق مطبوعات
فیروز سنز غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور

عابد کاظمی......دل سے دل تک کا مسافر

ابرار ندیم

عابد کاظمی سے میری پہلی ملاقات 14 ستمبر 2003ء کی سہ پہر ریڈیو پاکستان کے تربیتی مرکز اسلام آباد میں ہوئی جہاں پنجاب، خیبر پختون خواہ، آزاد کشمیر، بلوچستان اور سندھ سے بطور پروگرام پروڈیوسر منتخب دیگر احباب کے ساتھ میں اور عابد کاظمی بھی عرصہ دو ماہ کے لیے ابتدائی تربیت کی غرض سے جمع ہوئے تھے۔ لاہور سے اس ''بیچ'' میں میرے ساتھ اکمل شہزاد گھمن اور نائیلہ سیّد بھی تھیں مگر اکمل شہزد گھمن سے ایک رسمی ملاقات کے علاوہ نائلہ سیّد سمیت پورا ''بیچ'' میرے لیے اجنبی تھا۔

ان حالات میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک ایسے شخص کے لیے جو اپنی زندگی میں پہلی بار اتنے عرصہ کے لیے گھر سے دور ہوا ہو کسی اجنبی شہر میں ''بھان متی کے کنبے'' کے ساتھ رہنا کس قدر مشکل اور ''اندیشہ ہائے دور دراز'' کا سبب ہو سکتا ہے۔ گو اکمل شہزاد گھمن نے ایک ماہر نفسیاتی معالج کے انداز میں میری اس تشویش کو ایک ''نوید جانفزا'' سے دور کرنے کی کوشش ضرور کی مگر اکیڈمی میں آمد کے پہلے روز ہی ان ''طفل تسلیوں'' کی حقیقت اس وقت کھل کر سامنے آ گئی جب رات کے کھانے پر سب لوگ ڈائننگ ہال میں جمع ہوئے۔ پورے بیچ میں میرے سمیت سوائے دو چار احباب کے اکثریت ایسے لمبے چوڑے اور کھلے ڈھلے ڈیل ڈول کے حامل افراد کی تھی جن پر کسی پروڈیوسر سے زیادہ ''ڈبلیو ڈبلیو ایف'' یعنی ورلڈ ریسلنگ فیڈریشن کے پہلوانوں کا گمان ہوتا تھا۔ اکمل شہزاد گھمن بہت جلد ان لوگوں میں یوں گھل مل گیا گویا ان سے اس کی برسوں پرانی شناسائی ہو اور اُن میں اُٹھنا بیٹھنا اپنے انداز اور قد کاٹھ سے بڑی حد تک وہ بھی انہی کا ''انوٹ انگ'' لگتا تھا۔

میں کسی سہمی چڑیا کی طرح خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھا خود کو ان سب کے درمیان ایک بونا محسوس کر رہا تھا۔ ایک سے ایک لمبا تڑنگا کسی جنگجو قبیلے کے سردار ایسے حلیے اور مختلف رنگ، نسل اور زبان کا حامل پروڈیوسر۔ میں نے سوچا ''یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟'' یہ لوگ اسلام آباد بطور ریڈیو پروڈیوسر تربیت کی غرض سے آئے ہیں یا وفاقی دارالحکومت پر قبضے کے لیے؟

یہاں مجھے دل ہی دل میں اکمل شہزد گھمن کی ''نوید جانفزا'' والی غلط بیانی پر بھی خاصا غصہ آیا کہ جس کی روشنی میں میں نے ''حفظ ماتقدم'' کے طور پر اکیڈمی میں آنے والے حالات کا ''مردانہ وار'' مقابلہ کرنے کے لیے نئے سرے سے یعنی دوسری بار اچھی خاصی شاپنگ بھی کر ڈالی تھی جس میں دیگر ضروری لوازمات کے ساتھ بطور خاص شکار پور کا ڈبہ بند آم کا سپیشل کھٹا اچار بھی شامل تھا مگر اب مجھے محسوس ہو رہا تھا:

''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا''

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ بقول میاں محمد بخش:

پھس گئی جان شکنجے اندر جیویں ویلن وچ گنا
رہوں کہو ہن رہو محمد ہن رہوے تے منا

میری حالت اُس وقت ایسی ہو رہی تھی جیسے کسی ناکردہ جرم کی سزا میں ایک بے گناہ کو اپیل کے حق سے محروم کر کے اُسے بامشقت قید سنا کر جیل بھیج دیا گیا ہو۔ اس موقع پر مجھے ملکہ ترنم نور جہاں کا یہ پرسوز پنجابی نغمہ ٹوٹ کے یاد آیا:

''ہائے ربا وے اساں کلیاں بیٹھ کے رونا''

مگر پھر بھی میں نے فوراً ان کے گانے سے دل کو تسلی دی:

''نہ رو اے دل کہیں رونے سے تقدیریں بدلتی ہیں''

ایسے ہی میں بڑی شدت سے یہ جی چاہا کہ

کوئی ایسا اہل دل ہو کہ فسانہ محبت
میں اُسے سنا کے روؤں وہ مجھے سنا کے روئے

بہر حال اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ خود کو مکمل طور پر حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور تربیت کے دو ماہ کا یہ عرصہ لمحہ لمحہ گن کر گزارا جائے۔

اگلے روز کلاس روم میں جب باری باری تعارف کا سلسلہ جاری تھا چوڑے ڈیل ڈول، گھنی مونچھوں، سرخ آنکھوں، تنی گردن اور قدرے

گہری گندمی رنگت پر کھلے پائنچوں کی مائع لگی لٹھے کی شلوار اور کھلی ڈھلی قمیص کے ساتھ پہلی نظر میں عابد کاظمی مجھے پاکستان ٹیلی ویژن کراچی سے پیش کیے جانے والی یادگار ڈرامہ سیریل ''دیواریں'' کا غصیلا نوجوان ہاشم لگا جو اس ڈرامے کا مرکزی کردار تھا جسے کراچی کے خوبصورت اداکار مرحوم منصور بلوچ نے اس کامیابی کے ساتھ کیا تھا کہ آج بھی لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہے۔

وہی انداز، وہی لہجہ، وہی تمکنت اور کسی حد تک ملتا جلتا ناک نقشہ بھی۔ بس ہاتھ میں ایک کلہاڑی اور سر پر سندھی ٹوپی یا کندھے پر رکھی ایک سندھی اجرک کی کمی تھی۔ مجھے لگا یہ نوجوان اپنے مزاج اور ''فطری صلاحیتوں'' کے عین برعکس اپنے لیے ایک غلط شعبے کا انتخاب کر بیٹھا ہے۔ میرے خیال میں اپنے قد کاٹھ، حلیے اور غصیلے انداز کے ساتھ اسے اندرون سندھ ڈاکوؤں کے کسی خطرناک گروہ کا سردار ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ اس فیلڈ میں مجھے اس کے لیے فوری ''پروموشن'' کے امکانات خاصے روشن دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے ایک نظر عابد کاظمی اور پھر اُس کے اطراف میں بیٹھے نثار گھمن اور وسند مہر پر ڈالی جن کے حلیے میرے گمان کو مزید تقویت بخش رہے تھے۔ دیکھنے میں وہ بھی کسی ڈاکو سے کم نہیں تھے۔

مجھے حیرت اور شرمندگی کا پہلا جھٹکا اُس وقت لگا جب ابتدائی تعارف میں عابد کاظمی نے یہ بتایا کہ اُس نے ایم ایس سی کیمسٹری، ایم اے اُردو اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہیں۔ کچھ فرق کے ساتھ بیچ کے دیگر پروڈیوسرز کی ڈگریوں کی تفصیل بھی تقریباً ایسی ہی تھی حتیٰ کہ اکمل شہزاد گھمن نے بھی اپنے تعارف میں یہ بتا کر سب کو حیران کر دیا کہ اُس نے ''جمل یونیورسٹی'' سے انگریزی زبان کا ڈپلومہ بھی حاصل کر رکھا ہے اور اُن کے ساتھ وہ پنجابی کہانیوں کی ایک کتاب ''ایہہ کہانی نہیں'' کا بھی مصنف ہے۔ اکمل شہزاد گھمن کی پنجابی اور عابد کاظمی کے ایم اے اُردو نے میرے لیے ان دونوں احباب کے حوالے سے دلچسپی خاص طور پر بڑھا دی۔ کیونکہ ایک طالب علم کے طور پر ادب سے میری بھی کچھ دلچسپی تھی اور اس وقت تک اُردو اور پنجابی زبانوں میں میرے دو شعری مجموعے چھپ چکے تھے۔

میں نے اس وقت خود کو جنگل میں اکیلا ''قیس'' جانا اور ان دو دیوانوں کے یوں مل جانے پر وہ اطمینان اور خوشی محسوس کی جو قیس کو لیلیٰ کے مل جانے سے ہوتی ہوگی۔

میں نے سوچا ''خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے تین''

رفتہ رفتہ ہمارے مابین ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ کبھی میں اکمل شہزد گھمن اور عابد کاظمی اور کبھی صرف میری اور عابد کاظمی کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ عابد کاظمی اور میرے کمرے چونکہ قریب قریب تھے اس لیے ہماری ملاقاتیں زیادہ ہونے لگیں۔ شاید اس کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہو کہ گھمن کی حیثیت میرے لیے اور میری حیثیت اس کے لیے گھر کی مرغی والی تھی۔

بہرحال اس دوران عابد کاظمی سے ملاقاتوں کے دوران عام گپ شپ کے علاوہ باہمی دلچسپی کے جن موضوعات پر گفتگو رہی ان میں ادب، فلسفہ، تاریخ اور مذہب پر عابد کاظمی کی بے تکان، جامع اور مدلل گفتگو نے ہر بار مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس اس شدت سے دلایا کہ ایک دن میں نے پورے سیاق و سباق کے ساتھ دیگر دوستوں کی موجودگی میں عابد کاظمی سے اس کے متعلق اپنے پہلے تاثر کے حوالے سے یہ کہتے ہوئے معذرت کی:

چھیلا بابو تو کیسا دلدار نکلا
چور سمجھی تھی میں تھانیدار نکلا

اور پھر میری اس معذرت پر دیگر ''ڈاکوؤں'' نے جو قہقہہ لگایا اُس میں سب سے بلند آواز ڈاکوؤں کے اس سردار یعنی خود عابد کاظمی کی تھی۔

لاڑکانہ سندھ کے نواحی گاؤں مدیجی سے تعلق رکھنے والے عابد کاظمی سے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا تو مجھ پر کھلا کہ باہر سے کسی چٹان کی مانند دکھائی دینے والا یہ شخص اندر سے کس قدر ریشمی احساس سے جڑا پیار، محبت، خلوص اور انکساری سے بھرا ہوا ہے اور علمی و ادبی اور دُنیاداری کے حوالے سے قابل رشک اثاثوں کا مالک ہونے کے باوجود ریاکاری سے کوسوں دور ہے۔ اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ وہ کون سی زبان ہے جو دُنیا بھر میں سب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے تو میرا فوری جواب ہوگا ''محبت کی زبان''

یہ ایک ایسی بولی ہے جسے بولنے اور سمجھنے کے لیے کسی تربیت، کسی مہارت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بات دل سے نکلتی ہے اور کانوں کے رستے

دل میں اُتر جاتی ہے۔ جبکہ بعض صورتوں میں تو اس بولی کے بولنے، سمجھنے اور سننے کے لیے زبان اور کانوں کی محتاجی بھی درکار نہیں ہوتی اور یہی وہ خوبی یہی وہ کمال ہے جسے لوگ محبت کی بولی کا نام دیتے ہیں۔

عام سے لفظوں میں سیدھا سادا سا ایک خیال کسی بناؤ سنگار سے عاری بھولی بھالی صورت یا انسانی دست برد سے محفوظ ایک حسین قدرتی منظر کس طرح پڑھنے، سننے یا دیکھنے والے کے دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔ یہ کیا سائنس ہے؟ یہ معمہ تو کوئی دانشور ہی سلجھا سکتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ خیال اور جذبے کی سچائی اور شدت بعض صورتوں میں لفظوں کے در و بست اور بیل بوٹوں کی محتاج نہیں رہتی۔ شاعری کے تناظر میں اگر بات کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ محض کرافٹنگ کے زور پر کسی شعر کو زوردار نہیں بنایا جا سکتا تاوقتیکہ اس میں خیال کی ندرت اور آفرینی نہ ہو جس کے لیے پہلی شرط پیار، محبت، خلوص اور جذبے کی سچائی ہے اور یہی سب کچھ ہے جو اس وقت مجھے عابد کاظمی کے پہلے اُردو شعری مجموعے ''خواب ہواؤں پہ لکھوں'' کے مسودے کو پڑھتے ہوئے محسوس ہو رہا ہے۔

ایک شعری مجموعے کی صورت اُردو شاعری میں یہ عابد کاظمی کا پہلا قدم ہے جسے پڑھنے کے بعد یقیناً ہمارے سکہ بند ناقدین اپنے اپنے انداز میں اس مجموعے کی حیثیت کا یقین کریں گے۔ بطور ایک قاری کے میرا اس مجموعے کے حوالے سے پہلا اور شاید آخری تاثر بھی یہی ہے کہ اس مجموعے میں عابد کاظمی مجھے اپنی مکمل شخصیت کے ساتھ دکھائی دیا ہے اور میرے خیال میں فی زمانہ یہ ایک غیر معمولی خوبی ہے کہ کوئی لکھنے والا اپنی شخصیت کو بغیر کسی منافقت اور لیپا پوتی کے من و عن اپنے قاری کے سامنے کھول کر رکھ دے مگر ایسا کرنے کے لیے سب سے پہلے دل کی میل کو دھونا پڑتا ہے جو میرے ایسے دنیاداروں کے لیے یقیناً دُنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔

عابد کاظمی کی پوری شخصیت کو اگر ایک شعر میں سمیٹا جائے تو میں اُس کے لیے اس شعر کا حوالہ دوں گا۔

بے چینیاں سمیٹ کر سارے جہان کی
جب کچھ نہ بن سکا تو میرا دل بنا دیا

کمال کی بات یہ ہے کہ عابد کاظمی کا یہ مجموعہ پڑھتے ہوئے مجھے اس کی یہ بے چینیاں اپنے عروج پر نظر آئی ہیں۔ کسی کسی جگہ غم جاناں کی صورت میں اور کہیں غم دوراں کی شکل میں اس نے اپنی ذات اور اپنی ذات کے باہر دکھ درد اور غم کی جتنی تصویریں دیکھی ہیں اور اس سے پہلے اپنی ذات اور دوسروں کے لیے جو خوبصورت اور دلکش خواب دیکھے ہیں ان سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور اس کا نام ''خواب ہواؤں پہ لکھوں'' رکھ دیا ہے۔

گویا موضوعات کی ایک فراوانی اور رنگا رنگی ہے جو اس کے ہاں نظر آتی ہے جس میں ظلم منافقت، بے حسی اور خود غرضی پر مبنی رویوں پر خاص طور پر طنز کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے اس کی نظمیں ''زندگی کا یادداشت نامہ'' سن ۱۱: سن ۲۱، سن ۳۱، اعتراف اور پاگل اس کے گہرے مشاہدے، شعور، فکر اور وجدان کی بہترین ترجمان ہیں۔

دُنیا کو ایک گلوبل ولیج میں تبدیل کرنے اور دُنیا جہان کی پل پل کی خبریں رکھنے کا دعویٰ رکھنے والا انسان اپنے اردگرد اور خود سے کتنا بے خبر ہو گیا ہے اس کڑوی حقیقت کو بڑی خوبصورتی اور سادگی سے عابد کاظمی نے نظم ''باخبر'' میں بیان کیا ہے۔

عابد کاظمی کو پڑھتے ہوئے ایک اور احساس جو مجھے اس کی شاعری میں نظر آیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا شعری مجموعہ ''خواب ہواؤں پہ لکھوں'' ایک ایسے شخص کی ''کتھا'' ہے جو کسی ڈر، خوف اور مصلحت کے بغیر حالات و واقعات کو اپنے محسوسات کے ساتھ پوری سچائی اور دیانت داری سے بیان کرنے کی ہمت و قوت رکھتا ہے۔ ٹارگٹ کلنگ، ابن نذیر عباسی، پہچان، حسن ناصر کے نام اور تعاقب اس کی ایسی ہی نظمیں ہیں جنھیں لکھتے ہوئے نفع و نقصان کی سوچ کو بالائے طاق رکھنا پڑتا ہے اور ایسا کمال صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے دل میں سارے جہاں کا درد رکھتا ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اپنی ذات سے لاتعلق ہو کر کسی کونے میں بیٹھا ہوا وہ صوفی ہے جو ہر وقت یہ ورد الاپتا رہتا ہے:

''ہر پاسے بس توں ای توں ایں''

ممکن ہے اپنی جستجو اور لگن کے تعاقب میں کسی دن یہ ایسا بھی کر گزرے مگر فی الحال وہ ''انسانیت'' کے اُس منصب پر فائز ہے جو بنیادی طور پر اچھائیوں، برائیوں اور خوبیوں خامیوں کا مرکب ہے۔ جسے چاہنے اور چاہے جانے کے جذبوں کے ساتھ دُکھ، درد اور ہجر کے صدمات کا

بھی سامنا ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ کریں:

چاند بن کر رات کو روشن کرے
کون میری ذات کو روشن کرے

....

جو بھی دیکھا تھا میں نے خواب میں
رنگ وہ تعبیر سے نکلا نہیں

....

اجنبی رشتوں میں ہی اُلجھا رہا
آئینہ چہروں میں ہی اُلجھا رہا
روح کی گہرائی تک پہنچا نہیں
وہ تو بس لفظوں میں ہی اُلجھا رہا
اِک بھنور تھا ذات میری میں چھپا
تیز تر لہروں میں ہی اُلجھا رہا
دیکھتا پھولوں کو عابد کس طرح
میں سدا زخموں میں ہی اُلجھا رہا

....

کس نے دی تھی در جان پر دستک
کس کے قدموں کے دل پہ نشان تھے

....

قطرہ قطرہ پگھلا ہوں
خود سے ایسے نکلا ہوں
تیرے غم نے تھاما ہے
گر گر کر میں سنبھلا ہوں

قارئین! ایک وقت میں، میں بھی اُن لوگوں کا ہم خیال رہا ہوں جو نثری شاعری کو ہیئت کے اعتبار سے شاعری ماننے میں ہچکچاہٹ کا شکار رہے ہیں۔ گو آج بھی میرے اس موقف میں کچھ خاص تبدیلی نہیں آئی مگر عابد کاظمی کی غزلوں کے ساتھ جب اس کی نثری نظمیں پڑھنے کا مجھے موقع ملا تو ان نظموں نے اپنے مضمون یعنی خیال کی اہمیت، جذبے کی شدت اور انداز بیان نے اپنا اثر مجھ پر یوں چھوڑا ہے کہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ خوبصورت، سچا اور اچھا خیال خواہ کسی شکل میں کسی صنف میں بیان کیا جائے وہ پڑھنے یا سننے والے پر گہرا اثر ضرور چھوڑتا ہے۔ عابد کاظمی کو پڑھنے کے بعد نثری شاعری کے حوالے سے میرے خیالات میں جو ایک تبدیلی آئی ہے اُس کے مطابق نثری شاعری کرنے کا حق صرف ایک صورت میں ہونا چاہیے کہ اگر کوئی شاعر پابند نظموں کے ساتھ غزل بھی کہہ سکتا ہو۔ یقیناً بعض اعلیٰ اور خوبصورت مضامین اگر کسی وجہ سے گرفت میں نہ آ رہے ہوں تو اس بحث سے قطع نظر کہ وہ نثر ہے یا شاعری کسی بھی لکھنے والے کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اظہار کے لیے کسی بھی صنف یا ہیئت کا انتخاب کر سکے۔ جیسا کہ عابد کاظمی نے اپنے اوّلین شعری مجموعہ ''خواب ہواؤں پہ لکھوں'' میں نثری نظموں کے ساتھ غزلیں اور ترویئے شامل کی ہیں۔

میں عابد کاظمی کو اس کے پہلے شعری مجموعے کی اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں اور ساتھ میں اس کے لیے دُعا گو بھی ہوں کہ ''دل سے دل تک'' کا اُس کا یہ سفر بغیر کسی وقفے کے جاری و ساری رہے۔ گو اپنے تجربے کی بنیاد پر مجھے خوب اندازہ ہے کہ یہ دُعا ایک طرح سے بددُعا بھی ہے جیسے کہ پنجابی کی ایک بولی میں یوں کیا گیا ہے:

تینوں ہور مندا کیہ بولاں
تیرا کتے نیونہہ لگ جائے

مطلب تمہیں اور کیا بددُعا دوں کہ تمہیں کسی سے عشق ہو جائے مگر کیا ہے کہ اس بحث سے قطع نظر کہ یہ دُعا ہے یا بددُعا یہ طے ہے کہ عابد کاظمی وہ شخص ہے جو اپنے قول اپنی تحریر اور اپنے عمل میں پوری طرح اس راہ کا مسافر ہے جو دل سے دل تک جاتا ہے۔ اس کی بے چینی جس کا آغاز اس کی اپنی ذات سے ہوتا ہے رفتہ رفتہ سارے جہان کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ اس کی شاعری کو پڑھیں تو یہ بھید کھلتا ہے کہ یہ اوّل آخر ایک ایسے مرشد کا مرید ہے جو اس کی مہار پکڑے اسے اپنی مرضی کے راستوں پر لیے جا رہا ہے اور آپ کو یہ جان کر اور بھی حیرت ہوگی کہ اس کا مرشد کوئی اور نہیں خود اس کا اپنا دل ہے جس کے آگے یہ مجبور محض ہے۔ گویا ''سجناں دے ہتھ بانہہ اساڈی کیکر آکھاں چھڈ دے اڑیا''

اس معاملہ میں ایک طرح سے عابد کاظمی میرا ''پیر بھائی'' بھی ہے۔ سو اس ''راہ وفا'' میں جن مشکلات اور تکالیف کے ساتھ جس بے چینی اور بے قراری سے گزرنا پڑتا ہے اس کا مزا وہ ہی لے سکتا ہے جو اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر دوسروں کے دُکھ درد کو بھی محسوس کر سکے اور مرمر کے جیئے جانے کا ہنر جانتا ہو۔

ہم اذیت کو بھی اوروں سے جدا لیتے ہیں
چوٹ لگتی ہے تو اس کا بھی مزا لیتے ہیں

آپ عابد کاظمی کی شاعری پڑھنا شروع کریں آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا وہ اس ہنر میں کتنا طاق ہے۔

محبتوں کا شاعر...... عامر بن علی

شبنم لطیف

تجھے تجھ سے چرانا چاہتا ہوں
جنوں کو آزمانا چاہتا ہوں
ہمارے درمیاں جو موجزن تھا
وہی رشتہ پرانا چاہتا ہوں

تخلیقی اضطراب کی سرشاریوں اور بے قراریوں کی سرمست کیفیتوں میں رہنے والے لفظوں کا شہزادہ، عامر بن علی جس کے چار مجموعہ کلام یاد نہ آئے کوئی، سرگوشیاں، چلو اقرار کرتے ہیں اور اب ''محبت چھو گئی دل کو'' منظر عام پر آ کر اس کی فنی و تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

بنیادی طور پر یہ میاں چنوں کے باسی ہیں لیکن عرصۂ دراز سے بیرون ملک مقیم ہونے کے باوجود اپنی مٹی کی خوشبو کو محسوس کیے بنا نہیں رہ سکتے۔ خوبصورت لفظوں اور دل کش جذبوں کی ترجمانی سے عبارت ایک ایک مصرعے اور ایک ایک لفظ کو اپنے پہلو سے صفحۂ قرطاس پر رقم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تعلق خاطر، شناسائی و ناآشنائی، اُنسیت و رفاقت شاعری کے وہ خوش رنگ منطقے ہیں جہاں سے گزرنا نووارداں شہر سخن کا مقدر ہے۔ عامر بن علی نے بھی انہی گلیوں کی خاک چھانی ہے اور ان کے شب و روز کا احوال رقم کیا ہے۔

ان کی شاعری میں موضوعات قدرے بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہزاروں جہتیں اور بے شمار حقیقتیں ایسی ہیں جو تخلیق کار کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور لکھنے والا اپنے جوہر کے مطابق لکھ دیتا ہے۔ عامر بن علی چونکہ جدید و قدیم کے مطالعے اور مشاہدے سے اپنا مواد اخذ کرتے ہیں اس لیے اس کے ہاں قدیم و جدید رویوں کا امتزاج ملتا ہے جو ان کے اشعار کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

تاریکی سے روشنی تک سفر واقعی بڑا دلچسپ ہوتا ہے اور اس وقت تو یہ دلچسپی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جب یہ یقین ہو کہ اس سفر کے بعد روشنی کی منزل منتظر ہے۔ عامر بن علی کو بھی منزل پر پہنچ کر روشنی ملنے کا یقین ہے اس لیے اس کے ارادے متزلزل نہیں ہیں اور وہ پختہ عزم سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ عامر بن علی شعری اُفق پر پوری توانائی کے ساتھ جگمگا رہے ہیں۔

معروف ادبی شخصیات نے عامر بن علی کی ادبی و تخلیقی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے بقول امجد اسلام امجد ''عامر بن علی نوجوان شعراء کی نسل جو گزشتہ دس برس میں اُبھر کر آئی ہے ان میں ایک اہم نام ہے۔ اس کی شاعری نوجوان نسل کے ساتھ ساتھ ثقہ اور معتبر ادبی حوالوں سے بھی لائق توجہ اور پسندیدہ ہوتی جا رہی ہے۔''

معروف کالم نگار شاعر و ادیب عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں: ''اس نوجوان شاعر نے خارزار شعر میں شوقیہ قدم نہیں رکھا بلکہ یہ آبلہ پائی کسی منزل کی جستجو کا پتہ دیتی ہے۔ اس نے بیرون ملک اپنی بے پناہ کاروباری مصروفیت کے باوجود شعر سے اتنا تعلق استوار کر رکھا ہے۔ وہ محبتیں بانٹنے والا شاعر ہے۔''

معروف کالم نگار، شاعر و ادیب ندیم اسلم نے اپنے تاثرات یوں قلمبند کیے ''عامر بن علی محبتوں کا شاعر ہے۔ محبتیں کرتا ہے اور محبتیں بانٹتا ہے۔ اسے نظم اور غزل پر بھرپور دسترس حاصل ہے۔ ملنسار، خوش گفتار اور مضبوط کردار کا حامل ہونے کی وجہ سے پورے ادبی اُفق میں نمایاں نظر آتا ہے۔ مجھے امید واثق ہے وقت قریب میں اگر یہ سفر اسی تسلسل سے رکھا تو ادبی افق کا روشن ستارہ بن کر چمکے گا۔ اس کی غزلوں کا مجموعہ قبول عام و عوام کی سند حاصل کرے گا اور اس کی چمن شاعری نوجوان نسل کے لیے زادِ راہ ہو گی۔ اس کی فنی و فکری تخلیق جوہر کا اعتراف کرتے ہوئے ہمہ وقت حرف و ہنر میں محو رہنے والے گلستانِ ادب کے اس پھول کو ڈھیر ساری مبارک باد کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اس کی فنی و تخلیقی صلاحیتوں میں مزید نکھار آئے آمین۔

تم سے شکوہ نہ زمانے سے شکایت کی ہے
ہم ہی مجرم ہیں کہ اس دور میں چاہت کی ہے
لوگ ناداں ہیں جو پھر شور اُٹھا دیتے ہیں
شیخ نے تو سدا مسند کی حمایت کی ہے
عشق والوں نے کبھی ظلم پہ بیعت نہیں کی
ہم نے ہر دور کے جابر سے بغاوت کی ہے
رزم گاہوں میں کٹا کرتی ہے شاہوں کی حیات
حُسن والوں نے اداؤں سے حکومت کی ہے
چاہتیں اور بھی گزری ہیں زمانے میں مگر
چیخ کے ہم کرتے ہیں کب کس نے محبت کی ہے

....

چلی ہیں ایسی ہوائیں ہماری بستی میں
ہوئی ہیں خواب وفائیں ہماری بستی میں
جو سادہ دل کوئی بھولے سے جرم عشق کرے
بہت کڑی ہیں سزائیں ہماری بستی میں
یہ بددعا کا اثر ہے کہ امتحاں کی گھڑی
ہیں بے اثر سی دعائیں ہماری بستی میں
اسی لیے تو چھپا آفتاب خوشیوں کا
ہیں اب تو غم کی گھٹائیں ہماری بستی میں
غبار خوف یا لالچ ہے سارے ذہنوں پہ
دبی ہیں سچی صدائیں ہماری بستی میں
یہ چند چاک گریبان والے جو اُٹھے
کریں گی راج جفائیں ہماری بستی میں
ہے مشورہ جو مسافر ہیں اس طرف کے لیے
کلیجہ تھام کے آئیں ہماری بستی میں

طنز و مزاح

''ہونہار بے بی کے اتنے لمبے ہاتھ''

حافظ مظفر محسن

میں ہما کی سالگرہ میں جانا چاہتا تھا مگر اس ڈر سے کہ کہیں وہاں ''وہ'' بھی نہ آئی ہو اور گلے شکوے شروع ہو جائیں......... ویسے میں نے ''اس'' کے گلے شکووں کا توڑ پہلے ہی کر رکھا ہے کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ وہ سال میں دو بار سالگرہ مناتی ہے مگر غضب خدا کا اس بار ''اس'' نے چار دفعہ سالگرہ منا ڈالی.....یعنی 2012ء میں اس نے اپنا ریکارڈ توڑ ڈالا اور ہر پارٹی میں مختلف ''لوگ''؟.........ہونہار ''بے بی'' کے اتنے لمبے ہاتھ؟۔

ہے ناں.........بری بات؟!

ویسے ہما کی سالگرہ بھی تو میں ایک سال میں دوسری بار ''اٹینڈ'' کر رہا ہوں۔ پچھلی بار وہ میرے گفٹ سے خوش نہ تھی۔ مگر شکر گزار تھی کہ چلو.........تم نے حسن عباسی کی کتب تحفے میں دے کر اک نئے دوست کا اضافہ کر ڈالا۔ سنا ہے جلد ہما کی شاعری کی کتاب بھی منظر عام پر آئے گی.........''بڑی تصویر کے ساتھ؟'' مجھے بھی فیس بک پر اس نے اپنی تازہ تازہ تصاویر ارسال کی ہیں.........سلیکشن کے لئے اور اک تصویر پسند کرنے کا حکم بھی دیا ہے کچھ عریاں ہے ویسے شاعری بھی خاصی.........''اوپن'' سی ہے۔

آپ نے کیا کہا.........''بڑی شاعری''.........وہ تو غالب، فیض اور فراز کر گئے۔ اب شاعری بڑی ہو نہ ہو تصویر تو بڑی دکھائی دیتی ہے اور لوگ تصویر دیکھ کر ''عشق'' فرمانے لگتے ہیں۔ وہ تو بہت بعد میں پتہ چلتا ہے کہ تصویر پچیس سال پرانی تھی۔ اسی لیے یہ ''بزرگ'' شاعر ایسی پرستاروں سے ملتے ہوئے ڈر محسوس کرتے ہیں۔

میں نے بھی اک اٹھارہ سال پرانی اپنی تصویر نکال رکھی ہے کبھی اگر شاعری کی کتاب تیار ہو گئی تو یہ تصویر کتاب پر چسپاں ہو گی۔ ''مارکیٹ'' کی تصویر ہے لوگوں کو تصویر پسند آئے گی۔ شاعری.........وہ آج کل لوگوں کی توجہ سے دور ہے.........نہ یقین آئے تو امجد اسلام امجد سے پوچھ لیں۔ میری یہاں مراد یہ نہیں کہ شاعری نہ بکنے یا کم بکنے کے ذمہ دار امجد اسلام امجد ہیں۔ ویسے آج کل بڑی تصویر والی شاعری چھپ بہت رہی ہیں.........صرف سجنے کے لئے.........ڈرائینگ روم کی اینٹ بن جانے کے لئے۔

ہما کی سالگرہ کی سب سے منفرد اور اہم بات یہ ہے کہ وہ عمر کے حوالے سے جھوٹ نہیں بول رہی.........حالانکہ وہ چالیس کی ہے مگر سالگرہ اٹھارہویں ''شو'' کر رہی ہے۔ میں نے پوچھا.........کہ یہ جھوٹ تو نہیں؟ نہیں میری بیٹی حجاب کی عمر اٹھارہ سال ہی تو ہے۔ ''آف دی ریکارڈ'' آہستہ سے بولی.........کچھ کو پتہ ہوا اس کی سالگرہ ہے۔

ویسے سالگرہ میں جھوٹ کی ایسی آمیزش چل جاتی ہے.........کیونکہ شادی کارڈ پر لکھا ہوتا ہے.........''تناول ماحضر.......6 بجے''......جبکہ ملک منظور کے بیٹے کی شادی پر ''روٹی'' گیارہ بج کے چالیس منٹ پر کھلی تھی۔ وہ بھی ہمارے بڑے بھائی عابد پہلوان نے خود ہی ''روٹی کھل گئی جے'' کہہ کر ''عوام'' کو کھانے پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دیا تو انتظامیہ حواس باختہ ہو گئی کیونکہ ابھی ''مٹن کی دیگیں تو دم پر تھیں؟''۔ سلاد چٹ......مٹن غائب......چاول وافر مقدار میں موجود.......جنہیں لوگ ''بری نگاہ سے دیکھتے ہیں، مٹن کی موجودگی میں۔

حیات بٹ صاحب نے ایک شادی پر اس حوالے سے فائرنگ کا واقعہ سنایا.........ذرا آنکھیں بند کر کے تصور تو کریں کہ حیات بٹ آف چوبرجی کیسے مزے لے لے کر فائرنگ کا واقعہ سنا رہے ہوں گے۔

اسے ہی کارڈ پر لکھا تھا ''تناول ماحضر 5 بجے''......رات کے بارہ بج گئے (سکھوں کے پتہ نہیں رات کو بھی بارہ بجتے ہیں یا نہیں)۔ موتی گجر نے ایسے ہی بارہ بے اعلان کر دیا.........''روٹی کھل گئی جے؟......لوگ

روٹی پر ٹوٹ پڑے.........انتظامیہ نے فائرنگ شروع کر دی.........موتی گجر گھبرا گیا.........گھبراہٹ کے باعث اس نے بھی اپنی ٹریل ٹو کا بٹن دبا دیا.........ماماں جی.........ابھی ''پیر صاحب'' کے بارہ گن مین پہنچے ہیں جو اسی بات کی علامت ہے کہ پیر صاحب ایک گھنٹے تک پہنچ جائیں گے.........تو نے گھنٹہ پہلے ہی اپنا لنچ فرائی کر ڈالا ہے''!۔اب جو ہونا تھا ہو چکا.........عوام.........''آزاد'' ماحول میں من مرضی کر رہے تھے۔اس ڈر سے کہ گاجر کا حلوہ ختم نہ ہو جائے اک بابا جی نے تین پلیٹس بھر کے اک طرف رکھ لی تھیں.........اور اب مٹن کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔

میں نے مذاق میں پوچھا.........حیات بھائی، پیر صاحب کہاں مصروف ہیں؟۔انہوں نے اک ''پچھڑے والے پلازے پر نیا نیا قبضہ کیا ہے.........آج وہ اس کا معائنہ کرنے گئے ہیں!۔ دیگر ''عملہ'' ان کے ساتھ ہے۔ دیگر ''عملہ'' میں بھی بہت سا سٹاف شامل ہوتا ہے جو شادیوں میں بھی ''تباہی'' مچا دیتے ہیں۔ گدھے گھوڑے جتنی خوراک۔

''کہیں گھاٹے کا سودا نہ ہو گیا ہو''۔ میں نے پوچھا تو.........حیات بھائی زور زور سے ہنسنے لگے!.........پھر آہستہ سے میرے کان کے قریب منہ کر کے بولے.........''جاہل آدمی پیر صاحب کبھی بھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے بلکہ وہ خود سودا کرتے ہی نہیں.........کیونکہ کبھی کبھی منصف بھی تو بن جانا پڑتا ہے؟''۔

میرا موڈ اچھا تھا.........میں نے برجستہ کہہ دیا.........''ہا'' تم آئندہ اپنی سالگرہ پر ٹکٹ لگاؤ.........اتنے وی آئی پیز؟.........میری اس فرمائش پر ہنس دی.........ابھی تو آدھے دوست اس ڈر سے اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے بیٹھے میری سالگرہ انجوائے کر رہے ہیں کہ کہیں کسی چینل والے سالگرہ کا آنکھوں دیکھا حال ڈائریکٹ ٹیلی کاسٹ نہ کر ڈالیں!۔

ہمانے میرے کمزور سے ہاتھ پر اپنا وزنی ہاتھ زور سے مارتے ہوئے کہا.........اور میں سوچنے لگا کہ سالگرہ کی تقریب ہال میں ہو رہی ہے اور بہت سے لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے یہ سالگرہ کی تقریب انجوائے کر رہے ہیں.........بھلا وہ کیسے؟۔

میں دیر تک سوچتا رہا.........جب کچھ سمجھ نہ آیا تو میں گاڑی سٹارٹ کی اور یہ غزل سنتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا.........

وہ خاک اڑی یارو ہم درد کے ماروں کی
بستی ہے نصیبوں پہ بارات ستاروں کی

میانوالی میں مقیم معروف نوجوان شاعر سیّد علی نقوی کا پہلا شعری مجموعہ

صدائے ہجراں

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

ناشر: نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 0423-7351963

کرنل (ر) سید مقبول حسین کے زیر سرپرستی شائع ہونے والا امتیازادبی جریدہ

کہکشاں انٹرنیشنل

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

ملنے کا پتہ: ماہی کہکشاں انٹرنیشنل ۱۴-قاضی سعید مارکیٹ، ڈھوک سیداں روڈ، کمال آباد، راولپنڈی 0300-5119565

حنوط شدہ ہاتھ

موپساں/ترجمہ: ڈاکٹر کوثر محمود

تقریباً آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے میرے دوستوں میں سے ایک، لوئی...... نے ایک شام کالج کے کچھ دوستوں کو مدعو کیا۔ وہاں پنچ ☆۲ کا دور چل رہا تھا، ہم تمبا کو پیتے ہوئے، ادب اور مصوری پر گفتگو کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں گاہے گاہے فحش مذاق کی باتیں بھی چل پڑتیں جیسا کہ نوجوانوں کی محفل کا دستور ہے۔ اچانک دھڑ سے دروازہ پورے کا پورا کھلا اور میرے بچپن کے بہترین دوستوں میں سے ایک آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہوا۔ ''بتاؤ میں کہاں سے آرہا ہوں؟'' وہ فوراً ہی چلا کر بولا۔

'' میں شرط لگاتا ہوں کہ تم مابی (Mabilleایک لڑکی کا نام) کی طرف سے آرہے ہو'' ایک نے جواب دیا۔

دوسرا بولا، ''تم بہت زیادہ خوش دکھائی دے رہے ہو، تمہیں کہیں سے اُدھار پیسے مل گئے ہیں، تم اپنے چچا کو دفن کر کے آرہے ہو یا تم نے اپنی گھڑی کو میری خالہ کے پاس گروی رکھ دیا ہے''

''تم ابھی سے بہکنے لگے ہو'' تیسرے نے ترنت کہا، ''تمہیں لوئی کے گھر سے پنچ کی خوشبو آگئی اور تم پھر سے پینے اوپر چلے آئے''

''تم سب لوگ غلط ہو میں نارمنڈی ☆۳ میں واقع ''پ'' کے گھر سے آرہا ہوں، جہاں میں نے آٹھ روز گزارے؛ جہاں میرے دوستوں نے ایک نامی گرامی مجرم کی کہانی سنائی، اگر آپ لوگوں کی اجازت ہو تو میں اُس کا تعارف کراؤں؟'' ان الفاظ کے ساتھ اُس نے اپنی جیب سے ایک حنوط شدہ ہاتھ نکالا۔ وہ ہاتھ خوفناک، کالا سیاہ، خشک اور خاصہ لمبا تھا اُس پر سلوٹیں نمایاں تھیں اُس (ہاتھ کے) پٹھے غیر معمولی طاقت کو ظاہر کرتے تھے اور وہ اندر باہر سے باریک جلد کی طرح مڑھے ہوئے تھے اُس کی لانبی انگلیوں کے سروں پر لمبے اور پیلے ناخن تھے اور اُس کی بدبو میلوں تک محسوس ہوتی تھی۔

''کیا تم یقین کروگے'' میرے دوست نے کہا، ''ایک دن (بازار میں) ایک بوڑھے جادوگر کی پرانی اشیاء ☆۴ بک رہی تھیں جو ملک بھر میں مشہور تھا۔ وہ ہر ہفتے کے روز جادوگروں کی شبانہ محفل ☆۵ میں ایک جھاڑو پر سوار ہو کر جاتا تھا اور وہاں کالا اور سفید جادو کیا کرتا تھا وہ گائیوں کے دودھ کو نیلا کر دیتا تھا اور اُن گائیوں کی دُم کو ایسا کر دیتا تھا کہ جیسے وہ سینٹ آن تو این ☆۶ کے ساتھی ہوں ہوں۔ وہ بوڑھا بد معاش اس ہاتھ کے بارے میں خصوصی رغبت رکھتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ یہ ہاتھ ایک بدنام زمانہ مجرم کا ہے جسے ۱۷۳۶ء میں پھانسی پر چڑھایا گیا تھا کیونکہ پہلے تو اُس نے اپنی قانونی بیوی کا سر کاٹ کر ایک کنوئیں میں پھینک دیا، اس بات میں میں سمجھتا ہوں کہ وہ غلط نہ تھا، پھر اُس نے گرجا کے گھنٹے سے لٹکا کر اُس پادری کو بھی پھانسی دے کر مار ڈالا کہ جس نے اُسے شادی کے بندھن میں باندھا تھا۔ اس دہرے قتل کے بعد وہ فرار ہو گیا۔ اُس نے اپنی مختصر اور بھرپور زندگی میں درجن بھر مسافروں کو لوٹا، بیس کے قریب عیسائی راہبوں کو اُن کی خانقاہوں میں جلا کر راکھ کر دیا اور اُن کے ایک مذہبی صومعے کو داشتاؤں کی خلوت گاہ ☆۷ بنا دیا۔''

''لیکن تم اس خوفناک شے کا کیا کروگے؟'' ہم نے چیختے ہوئے کہا

''کیوں! میں اسے اپنے قرض خواہوں کو ڈرانے کیلئے اپنے دروازے پر اطلاعی گھنٹی کی ڈوری سے لٹکاؤں گا۔ میرا ایک نہایت کاہل مزاج بلغمی انگریز دوست؛ ہنری سمتھ کہتا ہے کہ یہ ہاتھ محض کسی عام ہندوستانی کا گوشت پوست ہے جسے جدید طریقے سے محفوظ کیا گیا ہے۔''

''میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم اس کی یخنی بنالو''

''جناب من! مذاق نہ کریں، میڈیکل کے ایک طالبعلم نے، جس کا سر دو تہائی سفید ہو چکا تھا نہایت سرد لہجے میں دوبارہ گویا ہوا۔ ''اور تم پی ایچ! میرے پاس تمہیں دینے کیلئے ایک مشورہ ہے وہ یہ کہ اس انسانی باقیات کو عیسائی طریقے سے زمین میں دفن کر دو؛ اس بات کا ڈر ہے کہ اس کا مالک آ کر تم سے اس کا مطالبہ نہ کر دے۔ اور پھر یہ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہاتھ (کے مالک کی) بری عادتیں تم میں سرایت نہ کر جائیں کیونکہ تم نے وہ کہاوت تو سنی ہوگی کہ'' جس نے ایک مرتبہ قتل کیا وہ پھر قتل کرے گا، جس نے ایک مرتبہ شراب پی وہ پھر پیے گا۔'' میزبان نے جواباً کہا پھر اُس نے اُس طالبعلم کیلئے پنچ کا ایک بڑا گلاس انڈیلا جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گیا پھر وہ نیم بیہوش ہو کر میز کے نیچے گر پڑا۔ اس کا یوں گرنا خوفناک قہقہوں

کا باعث بنا اور پی ایچ نے اپنا گلاس بلند کرتے ہوئے جام صحت تجویز کیا،" اُس نے کہا کہ میں تمہارے آقا کی دوبارہ آمد کیلئے پیتا ہوں" پھر ہم دوسروں باتوں میں مشغول ہو گئے پھر ہر کوئی اپنے گھر چلا گیا۔

اگلے دن جب میں اُس کے دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا تو میں اُس کے گھر میں داخل ہو گیا دوپہر کے تقریباً دو بج رہے تھے میں نے اُسے دیکھا وہ تمباکو پیتے ہوئے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

"اچھے تو ہو! کیا حال ہے؟" میں نے اُسے کہا "ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں" مجھے اُس نے جواب دیا اور تمہارا "ہاتھ" کہاں ہے؟

"میرا ہاتھ۔ تم نے ضرور اُسے میری اطلاعی گھنٹی کی ڈوری سے لٹکے ہوئے دیکھا ہو گا جہاں میں نے کل شب لوٹتے ہوئے اُسے لٹکا دیا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ تم یقین کرو! کہ کوئی بیوقوف نصف شب کے قریب مجھ سے بھونڈا مذاق کرنے کیلئے آیا اور میرے دروازے پر اطلاعی گھنٹی بجائی میں نے پوچھا کون ہے؟ لیکن کسی نے مجھے کوئی جواب نہ دیا میں دوبارہ لیٹ کر سو گیا"

میری جونہی آنکھ لگی تو دوبارہ گھنٹی بجی؛ اس مرتبہ مالکِ مکان تھا؛ وہ بے ادب گستاخ اور ازحد گنوار تھا۔ وہ بغیر سلام دعا کے اندر داخل ہوا اُس نے میرے دوست کو کہا، "جناب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس مُردار ہاتھ کو جو آپ نے اطلاعی گھنٹی کی ڈوری سے لٹکا رکھا ہے، فوراً یہاں سے دفع کریں؛ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو میں جبراً آپ کی یہاں سے چھٹی کرا دوں گا۔"

جناب من! پی ایچ نے بڑی گھمبیرتا سے جواب دیا، آپ اس ہاتھ کی بلاوجہ توہین کر رہے ہیں؛ آپ جان لیں کہ یہ ہاتھ ایک عالم فاضل شخص کا ہے۔☆۸

مالک مکان ایڑیوں کے بل گھوما اور جیسے آیا تھا ویسے ہی نکل گیا؛ پی ایچ بھی اُس کے پیچھے باہر گیا اور اپنے "ہاتھ" کو باہری دروازے کی ڈوری سے اُتار کر اندر لے آیا اور عقبی کوٹھڑی ☆۹ میں (دوسری) اطلاعی گھنٹی کی ڈوری سے باندھ دیا اور کہا کہ اس طرح کا ہاتھ بہتر ہے کہ یہیں رکھا جائے۔ "(میرے) بھائی! اب سوجانا چاہیے" نارمنڈی کے ٹراپسٹی درویش ☆۱۰ ہر شام مجھے سوتے ہوئے سنجیدہ خیالات القا کریں گے۔"

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں نے اُسے خدا حافظ کہا اور اپنی رہائش گاہ پر لوٹ آیا۔ میں اُس رات ٹھیک سے سو نہ سکا میں بے چین اور پراگندہ خاطر تھا۔ میں کئی مرتبہ سوتے سوتے اچانک اُٹھ بیٹھا ایک مرتبہ ایسا لگا کہ کوئی شخص میرے گھر میں گھس آیا ہے میں نے اٹھ کر اسے اپنی الماریوں اور بستر کے نیچے تلاش کیا بالآخر صبح ۶ بجے کے قریب جب مجھے کچھ سکون نصیب ہونا شروع ہوا کسی نے میرا دروازہ دھڑ دھڑ پیٹنا شروع کیا میں؛ اپنے بستر سے جست بھر کر اٹھا۔ یہ میرے دوست کا گھریلو ملازم تھا اُس نے برائے نام کپڑے پہنے اور پی ایچ کے گھر کی طرف بھاگا۔

اُس کا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا ہر کوئی مضطرب تھا اور اس واقعے پر بحث کیے جا رہا تھا یہ ایک ناقابل اختتام بحث تھی ہر کوئی سخت انداز میں خطبہ دے رہا تھا اور پیش آمدہ واقعات کو دہرا رہا تھا اور اُن پر ہر زاویے سے تبصرہ کر رہا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اُس کے کمرے تک پہنچا دروازے پر (پولیس کا) پہرہ تھا، میں نے اُنہیں اپنا نام بتایا، اُنہوں نے مجھے اندر داخل ہونے دیا۔ کمرے کے وسط میں چار پولیس والے کھڑے تھے (ایک کے) ہاتھ میں ایک چھوٹی سی نوٹ بک تھی۔ وہ بغور معائنہ کر رہے تھے؛ وہ گاہے گاہے آپس میں کچھ الفاظ کا تبادلہ کرتے اور (اُس نوٹ بک پر) کچھ لکھتے جاتے۔ دو ڈاکٹر صاحبان پی ایچ کے بستر کے قریب آپس میں کچھ گفتگو کر رہے تھے۔ پی ایچ اپنے بستر پر چاروں شانے چت مکمل بیہوشی کی حالت میں تھا۔ وہ ابھی مرا نہیں تھا لیکن اُس کی حالت خوفناک اور دگرگوں تھی اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی تھیں اُس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ایک ناقابل بیان ڈر کے ساتھ کسی خوفناک اور اجنبی شے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے۔ اُس کی انگلیاں مڑی تڑی تھیں؛ اُس کا جسم ٹھوڑی تک ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا کہ جسے میں نے اُٹھا کر دیکھا۔

اُس کی گردن پر پانچ انگلیوں کے نشانات تھے جو اُس کے گوشت میں کافی گہرائی تک دکھائی دیتے تھے۔ اُس کی قمیض پر کچھ خون کے قطروں کے داغ تھے اُسی لمحے اچانک ایک بات میرے ذہن میں آئی میں نے یونہی عقبی کوٹھڑی میں لگی اطلاعی گھنٹی کی ڈوری کی طرف دیکھا وہ حنوط شدہ ہاتھ اب وہاں نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے بلاشبہ اُس ہاتھ کو وہاں سے اتار لیا تھا کیونکہ وہ زخمی کے کمرے میں آنے والوں کی دہشت میں اضافہ کرتا تھا کیونکہ وہ ہاتھ واقعی خوفناک تھا لیکن مجھے کسی نے یہ نہ بتایا کہ کیا وقوعہ ہوا تھا۔

میں اپنی بات کو مختصر کرتا ہوں اگلے روز ایک اخبار میں اس جرم کی تفصیلات؛ جو پولیس جمع کر سکتی تھی کچھ یوں تھیں:

گذشتہ روز موسیو پی ایچ ب۔۔۔ جو قانون کا ایک طالبعلم ہے اور نارمنڈی کے ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، اُس پر کسی نے مجرمانہ نیت سے حملہ کیا۔ یہ نوجوان اُس روز رات دس بجے کے قریب گھر لوٹا تھا اُس نے اپنے ملازم بودین کو یہ کہہ کر رخصت کیا کہ وہ تھکا ہوا ہے اور وہ بستر پر گر کر سونا چاہتا ہے۔ آدھی رات کے قریب یہ شخص اپنے مالک کی گھنٹی کی آواز سن کر جاگا گھنٹی زور زور سے بج رہی تھی۔ اُسے ڈر لگا اور اُس نے ایک شمع روشن کی۔ گھنٹی ایک منٹ کیلئے خاموش ہوگئی لیکن دوبارہ اس زور سے بجی کہ اس ملازم کے اوسان خطا ہوگئے وہ ڈر کے مارے اپنے کمرے سے بھاگ نکلا تاکہ عمارت کے دربان کو جگا سکے۔ دربان پولیس کو خبر کرنے دوڑا تقریباً ۱۵ منٹ بعد دو پولیس کے سپاہی دروازے کو اندر دھکیل کر داخل ہوئے۔ اندر ایک خوفناک منظر اُن کی آنکھوں کے سامنے تھا کمرے کا فرنیچر اُلٹا پلٹا ہوا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ مضروب اور مجرم کے درمیان اچھی خاصی دھینگا مشتی ہوئی تھی۔ کمرے کے عین درمیان پشت کے بل، ہاتھ پاؤں اکڑے ہوئے، نیل و نیل چہرہ اور آنکھوں کی پتلیاں خوفناک حد تک پھیلی ہوئی، نوجوان پی ایچ ب۔۔۔ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اُس کی گردن پر پانچ انگلیوں کے دھنسنے سے پڑنے والے نشانات پانچ گولیوں کے لگنے سے پیدا ہونے والے سوراخوں کی طرح تھے جو بالکل آپس میں قریب قریب تھے۔ جرم کے محرکات کے سلسلے میں کوئی کسی پر شک و شبہ ظاہر نہ کیا جاسکا۔ ضابطے کی ضروری کاروائی کی جائے۔''

اگلے روز اسی اخبار میں چھپا:

''خطرناک مجرمانہ اقدام کا نشانہ بننے والے، مسٹی موسیو پی ایچ ب.....کہ جس کے بارے میں ہم نے گذشتہ کل خبر دی تھی، اُسے ڈاکٹر بوغ ڈو کے انہماک اور توجہ سے کیے گئے دو گھنٹے کے علاج معالجے کے بعد ہوش آگیا ہے۔ اب اُس کی زندگی خطرے سے باہر ہے لیکن اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ وہ دوبارہ کبھی مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو۔ مجرم کے متعلق کچھ پتہ نہیں ہے۔''

درحقیقت میرا دوست بیچارہ پاگل ہوگیا تھا۔

میں سات ماہ تک روزانہ ذہنی امراض کے شفا خانے میں، جہاں ہم نے اُسے رکھا ہوا تھا، اُسے دیکھنے جاتا رہا لیکن وہ بالکل صحت یاب نہ ہوا بلکہ صحت مندی کی کوئی رمق بھی نہ دکھائی دی۔ ہذیان کے دوران اُس کے منہ سے عجیب و غریب الفاظ نکلتے اور تمام پاگلوں کی طرح یہ خیال اُس کے ذہن میں راسخ ہوگیا تھا اور وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ کوئی بھوت پریت اُس کا پیچھا کر رہا ہے۔ ایک دن لوئی مجھے بے تابی سے ڈھونڈتا ہوا آیا اور اُس نے مجھے بتایا کہ وہ بہت زیادہ بیمار ہوگیا ہے۔ میں نے اُسے دیکھا تو وہ نہایت کرب کی حالت میں تھا۔ وہ دو گھنٹے تک تو بالکل چپ چاپ رہا لیکن اچانک ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور ہماری روکنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ بستر پر کھڑا ہوگیا۔ وہ بازوؤں کو لہراتے ہوئے چلا رہا تھا جیسے کوئی شکار (جال میں آکر) ڈر خوف سے چلاتا ہے۔

''اُسے پکڑو، اُسے پکڑو.....وہ میرا گلا گھونٹ رہا ہے.....بچاؤ.....بچاؤ.....مدد کو آؤ.....اُس نے چیختے چلاتے ہوئے دو مرتبہ کمرے کا چکر کاٹا پھر وہ منہ کے بل گرا اور اُس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

چونکہ وہ یتیم تھا لہٰذا (دوست ہونے کے ناطے) اُس کی لاش کو اُس کے چھوٹے سے گاؤں پ۔۔۔ واقع نارمنڈی تک پہنچانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی جہاں اُس کے ماں باپ ابدی نیند سو رہے تھے۔ یہ وہی گاؤں تھا جہاں سے وہ اُس روز لوٹا تھا اور اُس شام ہم لوئی ر۔۔۔ کے گھر چائے پی رہے تھے جہاں اُس نے ہمیں وہ حنوط شدہ ہاتھ دکھایا تھا۔ اُس کی لاش سیسے کے تابوت میں بند کی گئی۔

چار دن بعد میں بڑی اُداسی کے ساتھ اُس بوڑھے پادری کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا کہ جس نے میرے دوست کو (مقامی مذہبی) درسگاہ میں ابتدائی اسباق پڑھائے تھے اور اُسی چھوٹی سی مذہبی درسگاہ (سے ملحق قبرستان) میں اُس کی قبر کھودی جارہی تھی۔ اُس روز موسم نہایت خوشگوار تھا نیلا آسمان روشنی میں نہایا ہوا تھا؛ پتھریلی پہاڑی ڈھلوان پر جھاڑیوں میں پرندے چہک رہے تھے جہاں بچپن میں ہم دونوں بارہا سیاہ توت / گرنڈے ☆۱۱ کھانے آیا کرتے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ وہ مجھے اب بھی جھاڑیوں میں چھپ کر اشارے کر رہا ہے اور وہ اُس کھوہ میں داخل ہو رہا ہے جسے میں بخوبی جانتا تھا وہاں اُس کھوہ کے پرے کنارے پر غریب غرباء کو دفن کیا جاتا تھا؛ پھر ہم گھر لوٹ آیا کرتے تھے۔ ہمارے گال اور ہونٹ اُن پھلوں کے رس کی وجہ سے کالے ہو رہے ہوتے تھے کہ جو ہم کھاتے تھے۔ میں سیاہ توت / گرنڈے کی جھاڑیوں کو دیکھتا جا رہا تھا جو گرنڈوں سے لدی ہوئی تھیں۔ میں نے میکانکی انداز میں ایک گرنڈا توڑ کر منہ میں رکھ لیا پادری نے اپنی دعاؤں کی

کتاب نکال لی تھی اور زیرِ لب اپنی مناجات پڑھ رہا تھا اور میں گورکنوں کی کدالوں کی آواز سن رہا تھا جو قبر کھودنے میں مصروف تھے۔ اچانک اُن گورکنوں نے ہمیں پکارا! پادری صاحب نے اپنی کتاب بند کر دی اور ہم اُن کی طرف چل دیے تاکہ یہ جان سکیں کہ اُنہوں نے ہمیں کیوں بلایا ہے۔

اُنہیں (قبر کی کھدائی کے دوران) ایک (اور) تابوت دکھائی دیا تھا اور گینتی کی ایک ہی ضرب سے اُس کا (اوپری) ڈھکن کھل گیا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ (اُس تابوت کے اندر) ایک طویل القامت انسانی ڈھانچہ پشت کے بل پڑا ہوا تھا یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا ہے اور دعوتِ مبارزت دے رہا ہے۔ میری طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں لیکن شاید مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

''ارے دیکھو! دیکھو'' گورکنوں میں سے ایک چلا کر بولا، دیکھو اس مردے کا ایک ہاتھ کلائی تک کٹا ہوا ہے اُس نے مُردے کے پہلو سے ایک لمبا تڑنگا اور سوکھا سڑا ہاتھ اُٹھایا اور ہمیں دکھایا'' دیکھو تو! ایک دوسرے گورکن نے ہنستے ہوئے کہا، یہ مردہ ابھی اُچھل کر تمہاری گردن دبوچ لے گا تاکہ تم اُسے اُس کا ہاتھ لوٹا دو۔''

''چلو دوستو! پادری نے کہا مرنے والوں کو اپنی قبروں میں سکون سے رہنے دیں اور اس تابوت کے ڈھکن کو دوبارہ بند کر دو اور بے چارے اس متوفی پی ایچ کیلئے ہم کسی دوسری جگہ قبر کھودتے ہیں۔''

اگلے روز جب تمام کام نپٹ گئے تو میں پیرس لوٹنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے بوڑھے پادری کو پچاس فرانک دیے تاکہ اُس روح کو سکون پہنچانے کیلئے رسمِ عشائے ربانی ☆۱۲ کا اہتمام کرے جسے ہم نے اُس کی آخری آرام گاہ میں بے آرام کیا تھا۔ ☆۱۳

المرقوم ۱۸۷۵ء

حواشی و تعلیقات

☆۱ (موپساں کی یہ کہانی لال ماناش لورین ڈپوں تا موسوں L'Almanach lorrain de Pont-à-Mousson' میں پہلی مرتبہ ۱۸۷۵ء چھپا۔

☆۲ (پنچ ہندوستان کا ایک مشروب جو اصلاً ۵ اجزاء، تاڑی، چائے، شکر، پانی اور لیموں کے رس کا مرکب، امریکہ میں ایک ٹھنڈا مشروب جو پانی اور تیز شرابوں کا مرکب ہو جس میں شکر اور پھلوں کا رس ڈالا گیا ہو؛ اسی قسم کا ایک اور مشروب جو شرابوں کے بغیر صرف پھلوں کے گھولے رس سے بنایا گیا ہو)

☆۳ (Normandie اصل تلفظ، نارمان دی... موپساں کا پیدائشی صوبہ)

☆۴ (یہاں موپساں نے لفظ des frognes استعمال کیا ہے جس کا لفظی مطلب ہے Effect left by a dying monk یعنی ایک مرنے والے (بدھ) راہب کے متروکات/متبرکات ازقسم کپڑے برتن وغیرہ)

☆۵ (یہاں موپساں نے لفظ سبت Sabbat استعمال کیا ہے جس کا اصطلاحی مطلب یہودیوں کے نزدیک ہفتے کا ساتواں دن ہے اُس دن کو وہ مقدس جانتے ہیں اور اُس دن کوئی کام نہیں کرتے بلکہ آرام کرتے ہیں۔ اس لفظ کا ایک مطلب یہ ہے کہ جادوگروں اور جادوگرنیوں کی شبانہ محفل کہ جس کا صدرِ محفل شیطان ہوتا ہے اور اس میں وہ دادِ عیش دیتے ہیں اور کالا جادو کرتے ہیں۔ موپساں طنزاً جادوگر کو یہودی کہہ رہا ہے)

☆۶ (Sainte Antoine، پورا نام: Saint-Just, Louis Antoine Léon de (1767-94), ایک عیسائی مذہبی پیشوا۔ موپساں طنزاً عیسائی پیشواؤں کے ساتھیوں کو گائے کی دُم کہہ رہا ہے)

☆۷ (یہاں موپساں نے لفظ Serail استعمال کیا ہے جس کا انگریزی مترادف Seralgio ہے ترکی فارسی اور اُردو لغت میں اس کے معنی ہیں حرم سرائے، پردہ نشیں بیویوں یا داشتاؤں کی خلوت گاہ، قدیم ترکی سلاطین کے محلات)

☆۸ (اس کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ آپ جان لیں کہ یہ ہاتھ ایک نہایت عالم فاضل شخص کی ملکیت ہے)

☆۹ (یہاں موپساں نے لفظ Alcove استعمال کیا ہے جس کے معنی ہے قبہ، شہ نشیں، پس گوشہ، کمرے میں ایک چوڑا اور گہرا نہاں خانہ جو بستر یا کرسیاں وغیرہ رکھنے کیلئے بنایا گیا۔ کوئی قدرتی خلوت گاہ یا کنج۔ ہمارے دیہات میں بھی پہلے اس طرح کمروں میں عقبی کوٹھڑیاں بنائی جاتی تھیں جو عموماً نیچی چھت کی ہوتی تھیں اور ان میں عام استعمال کی اشیاء بستر وغیرہ رکھے جاتے تھے)

☆۱۰ (Les Trappists راہبندی کے گرجا گھر لاتھاپے La trappe میں پہلے پہل قائم شدہ رومی کیتھولک راہبوں کا سلسلہ کہ جن کی خصوصیت درویشانہ زندگی بسر کرنا تھا۔ یہ فرقہ سترھویں صدی میں تھا اور نمایاں ترین مصلحین میں Armand Jean Le Bouthillier de Rancé. شامل تھا)

☆۱۱ (اس کا انگریزی مترادف بلیک بیری ہے اور راولپنڈی کی مقامی زبان میں اسے گرنڈا کہا جاتا ہے۔ یہ نیم پہاڑی علاقے کی سدا بہار جھاڑی ہے سیاہ چمک دار چھوٹے بیر نما پھل ہوتے ہیں۔ کچا پھل گلابی ہوتا ہے پک کر چمکدار سیاہ اور بہت پکے ہوئے گرنڈے کی چمک ماند پڑ جاتی ہے یہ میٹھا اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ کوثر محمود)

☆۱۲ (Des messes۔ رومن کیتھولک، یونانی یا انجیلک گرجا گھروں میں عشائے ربانی کی تقریبات (برائے ایصالِ ثواب مرحومین) اور اس موقع پر گائے جانے والے نغموں کی دھن)

☆۱۳ (یہاں موپساں نے لفظ La sepultuse استعمال کیا ہے جس کے معنی ہیں، تدفین، مرقد، قبر، درگاہ وغیرہ۔ اگر تدفین کے معنی لیے جائیں تو پی ایچ کی تدفین مراد ہوگی اور اگر مرقد مراد لیا جائے تو وہ مُردہ جو پہلے سے وہاں موجود تھا اس کی بے آرامی مراد لی جائے گی۔ اپنے دوست کی روح کو ایصالِ ثواب یا اس کو سکون پہنچانے کیلئے عشائے ربانی پر ۵۰ فرانک خرچ کرنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن ممکن ہے کہ اپنے ڈر اور خوف کی وجہ سے کٹے ہوئے ہاتھ والے مردے کے سکون کیلئے وہ عشائے ربانی منعقد کروائی گئی ہو بہر حال دونوں طرف احتمال ہے۔ یہ پڑھنے والوں کی صوابدید پر ہے کہ وہ کس کو اختیار کرتے ہیں۔ ک۔م)

افسانہ

ہست نیست

نیلم احمد بشیر

میرے بیٹے علی نے ہمیشہ کی طرح اپنا سکول بیگ میری شاپ کے ایک کونے میں پھینکا اور سٹول کھینچ کر میرے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے بھی اپنا معمول کا سوال دہرایا۔ ''کھانا کھا لیا تھا؟''

یہ حقیقت ہے کہ ہر ماں اپنے بچے کے کھانے پینے کے بارے میں ہمیشہ متجسس اور فکرمند ہی رہتی ہے۔ چاہے بچہ کتنا ہی صحت مند اور ہٹا کٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اب بچہ رہا بھی نہ رہا ہو مگر اسے ہمیشہ یہی لگتا ہے کہ اس کے بچے نے ٹھیک سے کھایا نہیں ہوگا۔ وہ یقیناً بھوکا ہی ہوگا۔

''ڈونٹ وری مام۔ میں نے سکول میں لنچ کر لیا تھا اور اچھی طرح خوب پیٹ بھر کے کھایا تھا''۔ علی بیٹا روز مجھے مسکرا کر یہی جواب دیتا تو میں مطمئن ہو کر اپنی شاپ کے کسٹمرز کو اٹینڈ کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ جب تک میں شاپ میں رہتی علی اس بڑے اس بڑے سے وہائٹ مارش شاپنگ مال میں ہی گھومتا پھرتا رہتا۔ کبھی کبھار اپنا سکول کا ہوم ورک بھی کسی بنچ پر بیٹھ کر ہی مکمل کر لیتا۔ کبھی اس سٹور کبھی اس سٹور گھومتا، سکیورٹی گارڈز سے ہیلو ہائے کرتا، سٹور مالکان اور ملازمین سے گپیں لڑاتا وقت گزار لیتا تھا۔ سب اس سے بہت مانوس ہو گئے تھے اور اس کی موجودگی کے عادی بھی۔ اگر کبھی ایک آدھ دن وہ ان کی طرف نہ جا پاتا تو مجھ سے پوچھنے چلے آتے کہ علی کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے؟ نظر کیوں نہیں آ رہا؟ کوئی کہتا میں نے اس کے لئے چاکلیٹ کیک کا ایک پیس بچایا ہوا ہے، کوئی کہتا اسے کہنا آ کر فریش لیمونیڈ پی لے تو کوئی اس کے لئے یونہی کوئی گفٹ چھوڑ جاتا۔

شاپنگ مال سٹورز والے گورے، کالے، چینی، انڈین، پاکستانی، امریکن اب کتنے ہی سالوں سے ہماری فیملی کی طرح بن گئے تھے اور علی سے تو خاص طور پر بہت ہی شفقت سے پیش آتے تھے۔ علی سکول میں بہت اچھے گریڈز لیتا تھا جس کی وجہ سے سب علی سے بہت خوش ہوتے اسے تھپکی دیتے اور اس کی سکول کارکردگی کو سراہتے رہتے تھے۔

گوڈرائیوا چاکلیٹ سٹور پر کام کرنے والا بوڑھا نیلسن تو خاص طور پر علی سے بہت پیار کرتا تھا۔ کبھی کبھی جب میں اور علی کے ابو اسے ہنس کر کہتے ''لگتا ہے تم تو علی کے نانا اور دادا کی جگہ لے چکے ہو۔'' تو وہ بڑا خوش ہوتا۔ علی بھی اسے گرینڈ پا کہہ کر بلاتا۔ مجھے اپنے دل کی گہرائی میں افسوس کی ایک لہر کروٹ لیتی محسوس ہوئی کہ علی کے نانا اور دادا اس سے کتنے دور تھے۔ وہ اسے یوں بڑھتے پھلتے پھولتے، زندگی میں آگے کی طرف رواں ہوتے دیکھ نہ سکتے تھے مگر پھر وطن سے دور رہنے والوں کے ساتھ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔

ہم لوگ قریباً پندرہ سال سے امریکہ میں رہائش پذیر ہیں اور ہر لحاظ سے سیٹ ہیں۔ یہاں کے اچھے نظام اور سکھ چین دیکھ کر کئی بار دل میں حسرت جاگتی ہے کاش ہمارے اپنے پیارے پاکستان میں بھی اسی طرز سے لوگ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ہمارا وطن بھی اتنا ہی پرابلم فری ہو جائے مگر جس طرح ہمارے حکمران ایک کے بعد ایک آتے ہیں اور ملک کے وسائل اور دولت، اختیارات کو لوٹتے ہیں اس کے بعد ان سے کسی بہتر نتیجے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

امریکہ میں رہنے والے بچوں کا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ اور منافقت کے گڑھے سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ ہمارا علی بھی ایسا ہی ہے۔ میں اور اس کے ابو دو تین سال بعد وطن عزیز کا ایک چکر لگاتے ہیں تو وہ بھی ہمراہ ہوتا ہے مگر پاکستان کو زوال پذیر دیکھ کر بہت حیران پریشان ہو جاتا ہے۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ملک آخر ایسا کیوں ہے، جیسا کہ ہے اور امریکہ کی طرح کیوں نہیں ہے۔ علی سچ کہنے سے بالکل بھی نہیں ڈرتا اور جہاں موقع ملے تنقید شروع کر دیتا ہے۔

ابھی دو سال پہلے ہی کی تو بات ہے۔ ہم لوگ پاکستان گئے ہوئے تھے، رشتہ داروں، دوستوں سے میل ملاقات میں مصروف تھے اور خوش تھے۔ بڑے بھیا نے جن کا تعلق ایک پرانی سیاسی پارٹی سے ہے، ہمیں اپنے ایک جلسے میں شرکت کی دعوت دی۔ یہ پارٹی ایک زمانے میں

اپنے انقلابی منشور اور متحرک قائدین کی وجہ سے بہت مقبول تھی مگر اب گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اس کے لالچی، خود غرض عہدیداروں نے ایسی خباثت بھری کرپشن کی کہ عوام کا ان پر سے اعتماد جاتا رہا۔ الیکشن کے قریب آتے ہی پارٹی پھر برسراقتدار رہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور یہ جلسہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ ہم سب اس پارٹی کی نیک نیتی کے بارے میں کافی مشکوک تھے مگر بھیا کو شاید اب بھی ان سے کچھ امید تھی جو مسلسل ان کے بجھے ہوئے چراغوں کے دھوئیں کو روشنی کی پرچھائیں سمجھنے کی غلط فہمی میں گرفتار رہتے تھے۔

بہرحال ان کے جلسے کی ہی بات ہے، خوب زور شور سے تقریریں ہو رہی تھیں۔ پاکستان کو ایک بہتر ملک بنانے کے لئے منصوبے بنائے جا رہے تھے کہ یکدم کسی نے کہا ''ینگ بلڈ کو آگے آنا چاہیے۔ نئی جنریشن کی رائے معلوم کرنا چاہیے کہ وہ اس ملک کے لئے کیا اور کیسا سوچتے ہیں۔'' وغیرہ وغیرہ

چند نوجوان بچے سٹیج پر آئے اور پرجوش تقریروں اور جذباتی مذہبی نعروں سے پنڈال کو گرمانے لگے۔ ہر طرف تالیاں بجنے لگیں اور نوجوان مقررین پر تحسین کے ڈونگرے برسائے جانے لگے۔ یکا یک بھیا کو کچھ خیال آیا۔ انہوں نے علی کی طرف دیکھ کر اعلان کیا۔ ''اتفاق سے میرا نوجوان اور فیورٹ بھانجا علی اس وقت یہاں موجود ہے۔ یہ امریکہ میں رہتا ہے مگر آج کل پاکستان کا مہمان ہے اور آخر کیوں نہ ہو بھئی پاکستان میں اس کے باپ دادا کی جڑیں ہیں۔ میں علی کو اظہار خیال کی دعوت دیتا ہوں۔ وہ آئے اور ہمیں بتائے کہ آج ہمارا ملک کہاں کھڑا ہے اور ہمیں کس سمت جانا چاہیے۔'' یہ سنتے ہی علی نے فوراً میری طرف دیکھا اور پھر مثبت اشارہ دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور سٹیج پہ جا کے مائک تھام لیا۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے گھاگ سیاستدان، اس میدان کے پرانے کھلاڑی مزید چوڑے ہو کر کرسیوں پر پھیلنے لگے۔

''ہیلو اینڈ السلام علیکم'' علی نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ ''میں ایک امریکن پاکستانی ہوں اور میری لینڈ سٹیٹ میں ایک سرکاری سکول میں زیرتعلیم ہوں۔ اس کے علاوہ میں اپنی پاکستانی کمیونٹی کی پاکستان ایسوسی ایشن کا بھی اہم رکن ہوں۔ میں نے آپ سب کی تقریریں سنی ہیں اور میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ سب لوگ منافق اور جھوٹے ہیں۔ آپ صرف اپنے فائدے کی ہی بات کر رہے ہیں ملک کے وسیع تر مفاد سے آپ کو قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

علی کے منہ سے یہ باتیں سنتے ہی مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ چاروں طرف ایک سناٹا سا چھا گیا۔ ایک لمحے کو تو میں بھی دل ہی دل میں کانپ کر رہ گئی۔ ''یاالٰہی خیر۔ یہ امریکن بچہ کہیں کچھ اوراول فول نہ بک دے۔ میں نے گھبرا کر سوچا علی مکمل اعتماد سے بولتا چلا گیا۔

''ہم امریکہ میں رہتے ہیں جہاں معاشرے کی بنیاد ہی دیانتداری اور نظم و ضبط پہ ہے۔ لوگ اپنے ملک کے ساتھ مخلص ہیں جبکہ پاکستان میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہاں حکمرانوں کو محض اپنی جھولیاں بھرنے کی پڑی رہتی ہے اور عوام بھوکے، ننگے، کام چور اور آسانیاں تلاش کرنے والی قوم بن چکے ہیں۔ قانون کی کوئی بالا دستی نہیں اور ہر ادارہ زمین بوس ہو چکا ہے۔ آئی ایم سوری مگر آپ لوگوں کو پہلے امریکہ کی طرح اصول پرستی، فراخدلی اور تعمیری سوچ اپنانا ہو گی۔ وہاں ہر ایک کو اپنا حق ملتا ہے۔ کوئی کسی کا حق نہیں مارتا۔ فیصلے سفارشوں پہ نہیں، میرٹ پہ ہوتے ہیں۔ آپ لوگوں کو پہلے اپنا ذاتی اور قومی کردار ٹھیک کرنا ہو گا۔ یہ ملک تبھی ترقی کرے گا اور دنیا کی مہذب قوموں کے شانہ بشانہ چل سکے گا۔ ان خالی خولی تقریروں کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ لوگ تکلیف ہی نہ کریں تو بہتر ہے۔''

علی یہ سب کہہ کر چپکے سے بنے تلے قدم اٹھاتا سٹیج سے نیچے اتر آیا اور مجمع میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا، میں خوش تھی یا شرمندہ؟ پھر چند ہی لمحوں بعد بھیا نے صورتحال کو سنبھال لیا۔ علی کی کمر تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

''یہ نوجوان بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ میں خوش ہوں کہ میرا امریکہ سے آیا ہوا نوجوان بھانجا سچ بولنے کی صلاحیت اور جرات رکھتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے ملک کا ہر نوجوان ایسی سوچ اپنائے، تبھی اس ملک کے مقدر کا ستارہ سنور سکتا ہے۔''

بھائی جان کی یہ بات سن کر میں نے سکھ کا سانس لیا اور ہولے سے مسکرا دی۔ میں جانتی تھی کہ میرا بیٹا کہتا تو سچ تھا مگر پھر سچ سننے کا حوصلہ پاکستان کی سیاسی پارٹیوں یا حکمرانوں میں ہوتا ہی کہاں ہے؟

"ڈیئر کزن! شکر کر تجھے ابو کی باتوں نے بچا لیا ورنہ یہاں تو ایسی کوئی بات کرے تو اسے جوتے اور ٹماٹر کھانے پڑ جاتے ہیں۔" بھائی جان کے مین اچ بیٹے ارسلان نے علی کے کندھے کو ہولے سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ میں اور علی کھلکھلا کر ہنس دیے۔

وہائٹ مارش شاپنگ مال میں سٹور کو چلتے اب بہت سے سال بیت گئے ہیں۔ ہم معاشی طور پر کافی حد تک مستحکم ہو چکے ہیں۔ علی بھی تعلیم کے میدان میں منزلیں مارتا ماشاءاللہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے تو اس نے سکول کے ایف ایم ریڈیو سٹیشن پر بطور اینکر پرسن کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کو اعتماد سے گفتگو کرتے اور میوزک پلے کرتے سن کر ہم بہت خوش ہوتے ہیں کہ ہمارا بچہ امریکہ میں ہر طرح سے اپنی تخلیقی اور تعلیمی صلاحیتوں کا اظہار کرنے کے مواقع حاصل کر رہا ہے اور اسے کسی بھی طرح سے پیچھے نہیں رہنا پڑتا۔ وہ جو جی چاہے کرتا ہے اور ماں باپ کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بھلا کیا بات ہو سکتی ہے؟

سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا کہ حال ہی میں ایک واقعہ جو وقوع پذیر ہوا۔ پوری دنیا یہ خبر سن کر دنگ رہ گئی کہ امریکی فوجیوں نے رات کی خاموشی میں چپکے سے ایک سیکرٹ آپریشن کیا اور ایبٹ آباد میں مقیم اسامہ بن لادن اور اس کے اہل خانہ کو ٹارگٹ کر کے مار دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ امریکی میڈیا نے اسامہ، اس کی بیویوں، بچوں، ملازمین کسی کو بھی ٹی وی پر دکھایا نہ ان کے بیانات سنوائے۔ آج کے میڈیا Awareness (اویئرنیس) دور میں یہ بڑی اچنبھے کی بات ہے۔ آج تو دنیا کسی کونے میں کوئی مکھی یا مچھر بھی مر جائے تو فوراً کیمرے کی آنکھ اسے محفوظ کر لیتی ہے اور میڈیا پر نظر کر دیتی ہے۔ امریکہ کا دشمن جان مارا جائے اور کیمرہ کچھ بھی نہ دکھائے۔ اس سے شکوک وشبہات اور ابہام تو پیدا ضرور ہوتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ امریکیوں کو تو جاب ویل ڈن ہونے کا اطمینان اور سکون چاہیے تھا، لہٰذا وہ اسامہ کی ہلاکت اور سمندر برد ہونے کی خبر سنتے ہی خوشی سے جھوم اٹھے اور ناچتے ناچتے سڑکوں پر نکل آئے۔ شیطان کے خاتمے کا رقص مناتے، وہ ایک دوسرے کو مبارکبادیں دے رہے تھے اور جیسے امریکہ کی ٹی شرٹس پہنے خوب اترا رہے تھے۔

علی بھی بہت خوش تھا۔ بار بار کہہ رہا تھا "دیکھا مام ڈیڈ، آخر امریکہ نے دنیا کے سب سے بڑے دہشت گرد کا خاتمہ کر ہی دیا نا۔ واٹ اے گریٹ کنٹری۔ امریکہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اب ساری دنیا میں امن چین ہو جائے گا۔ شکر ہے آپ لوگ امریکہ چلے آئے اور میں یہاں پیدا ہوا۔" وہ ہنستا مسکراتا اٹھا اور ٹی وی پہ سی این این کی خبریں دیکھنے لگے۔

اگلا دن امریکیوں کے لئے کرسمس سے بڑھ کر خوشی کا دن تھا۔ ہر طرف سیلی بریشن جاری تھی۔ آفٹر سکول ایکٹی وٹیز میں اس روز علی کا ایف ایم ریڈیو پروگرام تھا جس پہ علی نے تازہ ترین صورتحال اور خبروں کو موضوع سخن بنایا اور بار بار خوش ہو کر اعلان کیا "We got him" (ہم نے اسے پکڑ لیا) ایکسائٹمنٹ کے مارے اس سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے کتنے ہی خوشیوں کے نغمے پلے کیے اور جوکس سنائے۔ پروگرام بہت خوشگوار ماحول میں چلتا رہا۔ اتنی کالز آئیں کہ ٹیلی فون کی لائنیں جام ہو کر رہ گئیں۔

کوئی امریکی فوجیوں کی شجاعت، کوئی ملٹری سٹریٹجی، کوئی پاکستانی حکومت کی نالائقی بیان کر رہا تھا اور کوئی کہہ رہا تھا کہ پاکستان ایک جھوٹا ملک ہے، اتنے بڑے دہشت گرد کو چھپا رکھا تھا اور ہم سے امداد بھی بٹورے جا رہا تھا۔ رات کو کھانے کی میز پر علی ہمیں یہ سب بتا رہا تھا مگر میں اور علی کے ابو کچھ چپ چپ سے تھے۔ ہمیں اس روز پہلی بار احساس ہوا کہ ہمارے گھر میں تو ایک امریکن رہتا ہے۔ ایسا جس کی سوچ ہماری سوچ سے جدا ہے اور جس کے نظریات انہی حقائق پر مبنی ہیں جنہیں امریکی میڈیا اپنے عوام کو سپون فیڈ (Spoon Feed) کرتا ہے۔ ہم تیسری دنیا کے تارکین وطن، ہماری کیا مجال کہ ہم آقاؤں کی پالیسیوں، ترجیحات اور حتمی فیصلوں کے آگے کچھ کہہ سکیں۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنے آلو گوشت اور چپاتی کو سامنے رکھے اجنبی نظروں سے علی کی طرف دیکھتے رہے اور علی اپنی سٹیک اور بیک پوٹیٹو (Steak and Bake Potato) کی پلیٹ ہاتھ میں لیے خبریں دیکھنے میں مصروف رہا۔

فاکس چینل پہ ان کی مشہور ٹاک شو اینکر Creata van اپنا ٹیڑھا منہ گول گول گھما کر ہمیشہ کی طرح مسلمانوں کو لعن طعن اور گوروں کو دنیا کی مہذب ترین اقوام قرار دے کر اپنے دلائل

پیش کر رہی تھی۔ بار بار بش کی وہ نیوز کلپنگ Clipping بھی دکھائی جا رہی تھیں جس میں اس نے کہا تھا، ہم پاکستان کو پتھر کے دور میں پہنچا دیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ عجب سرکس لگا ہوا تھا۔

''مگر امریکہ تو دنیا کا خود سب سے بڑا دہشت گرد ہے۔ تیل اور طاقت کے لئے پوری دنیا پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ یہ آج کے دور کی کالونائزشن ہے۔'' علی کے ابو رہ نہ سکے اور بے قابو ہو کر بولے۔

نوجوان امریکی کے پاس اپنے ہی دلائل تھے۔ میں نے گھبرا کر چینل ہی بدل دیا۔ کسی انڈین چینل پہ ''مائی نیم از خان'' چل رہی تھی۔ تو یہ اب انٹرٹینمنٹ کی دنیا کے بھی یہی موضوع ہو گئے ہیں۔'' میں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا اور کھانے کی میز سے برتن سمیٹنے لگی۔

''دنیا بدل چکی ہے۔ اب عشق و محبت کے بجائے، دہشت گردی اور عالمی صورتحال کو موضوع بنائے بغیر انٹرٹینمنٹ کی دنیا بھی کامیابی حاصل نہیں کر پاتی۔'' انہوں نے سمجھانے کے انداز میں مجھے جواب دیا۔

اگلے روز شاپنگ مال میں اپنے سٹور پہ کام کر رہی تھی کہ حسب معمول تین بجے علی مجھے دروازے سے آتے دکھائی دیا۔ وہ کچھ تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا مگر میں نے اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ آتے ہی اس نے حسب معمول بستہ ایک کونے میں رکھا مگر نہیں اسے رکھنا نہیں پھینکنا ہی کہنا زیادہ مناسب ہوگا اور منہ بسور کے بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہو بیٹا؟ اتنا موڈ کیوں خراب ہے۔ کھانا کھا لیا تھا؟'' میں نے حسب معمول اس سے مدرانہ سوالات کرنے شروع کر دیئے۔

''آپ کو پتہ ہے آج سکول میں کیا ہوا؟'' علی نے آنسو بھری آنکھوں سے کہا۔

''کیا؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا اور پیار سے اسے چھوا۔

''جیسے ہی سکول پہنچا۔ سکول کے ساتھیوں نے کہا، ہمیں مبارکباد دو۔''

''اچھا؟ وہ کس بات پر؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کہنے لگے، ہم نے تمہارا باپ پکڑ لیا، اسے مار دیا اور پھر سمندر میں دفنا دیا اور تم کچھ نہ کر سکے۔ وہ مجھ پر ہنس رہے تھے۔'' وہ غصے سے بولا۔

''اوہ۔'' موقع کی نزاکت سمجھ کر میں خاموش ہو گئی۔ میرے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔

''ہائے میرا بچہ.........'' میرے لبوں سے نکلا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھے اپنا بچہ بہت معصوم، بے خبر اور بے ضرر سا لگا۔ اسے تو خبر ہی نہیں تھی کہ وہ ان میں سے نہیں ہے، جن میں وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہے۔ اسے تلخ حقیقتوں کا ادراک ہو رہا تھا اور میرا دل ٹوٹ کر پارہ پارہ ہوا جا رہا تھا۔

''بس بیٹا۔ اب احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ ہم یہاں رہتے ہیں۔ یہ ہماری چوائس تھی کہ ہم یہاں آئیں، رہیں، ان کے نظام اور برتر معیشت میں سے اپنا حصہ ڈھونڈیں، ہمیں خاموش رہنا ہوگا۔'' میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''مگر مام، میں تو امریکن بارن ہوں۔ مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے؟'' علی اب بھی لاجک کی بات کرتا چلا جا رہا تھا۔

''مام یہ ڈیم امریکن اتنے متعصب، تنگ نظر اور تھڑدلے ہوتے ہیں۔ اتنی محدود سوچ ہے ان کی۔ انہیں تو دنیا کی سیاسی، معاشی، جغرافیائی سچویشن کا کچھ بھی پتہ نہیں ہے۔ بس یہ لوگ صرف اپنے آپ کو صحیح سمجھتے ہیں۔ آخر ہم سب مسلمان تو دہشت گرد نہیں ہیں۔ ہم امن پسند ہیں۔ کیا U.S.A میرا ملک نہیں ہے؟ مام آپ لوگوں نے مجھے یہاں کیوں پیدا کیا۔ بڑا کیا؟ Where do I belong Mom? علی کے سوالوں نے مجھے ہمیشہ کی طرح لاجواب کر دیا تھا۔

''نہ میرا رنگ گوروں کی طرح سفید ہے نہ کالوں کی طرح سیاہ۔'' وہ اٹھا اور اپنے چہرے کو سامنے لگے شیشے میں بغور دیکھنے لگا۔

''میں جا رہا ہوں مام!'' وہ یکا یک اٹھا اور اپنی جیکٹ پہننے لگا۔

''کہاں؟'' میں نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

''آج میں اس شاپنگ مال کے سب سٹور والوں کو جواب تک میری دوستی کا دم بھرتے تھے، جا کے سنا دوں گا کہ تم امریکن کس قدر متعصب اور مطلب پرست ہو۔ تم لوگ تنگ نظر ہو۔ کوئی یہاں میرا نہیں، نہ ہی میرا دوست ہے، وہ گرینڈ پا بھی جھوٹ موٹ کا نانا دادا بنا ہوا ہے۔ یہ سب لوگ ہم کو تعصب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دشمن سمجھتے ہیں۔ میں ان کو خوب سناؤں گا مام۔'' میرے آوازیں دینے کے باوجود علی پیر پٹختا ہوا باہر چل دیا۔ اب اس نے میری ایک نہ سنی۔ امریکن بھلا کہاں رکتے یا کسی کی سنتے ہیں؟

افسانہ

وہ قربتیں، یہ فاصلے

ڈاکٹر انور نسیم

تین نمبر میں دوپہر کے وقت ہمیشہ بہت بھیڑ ہوتی ہے! شاید اس لیے کہ وزارت خارجہ کے بہت سارے لوگ اس وقت "لنچ بریک" لے کر شہر جاتے ہیں اور کیوں نہ جائیں اس لیے کہ شہر میں بھی تو خوب رونق اور گہما گہمی ہوتی ہے۔ بالخصوص گرمی کے موسم میں ایہ "لنچ بریک" بھی بہت پرلطف چیز ہے کہ جب لوگ چند گھنٹے گفتگو اور عالمی مسائل پر تبادلہ خیال کرتے کرتے "نڈھال" ہو جاتے ہیں تو پھر یہ وقفہ! اس کے اپنے دفتر کے بالکل سامنے وزارت خارجہ کی یہ عالیشان عمارت تھی جہاں رات گئے تک روشنی رہتی تھی! تقریبات، مذاکرے نادر فائلوں کے انبار! خوش پوش لوگ! سیکرٹری، سبھی کچھ اس عمارت میں تھا۔ خاموشی سے بس کے ایک کونے میں بیٹھا وہ جانے کیا کچھ سوچ رہا تھا! یہ بڑا دلچسپ تجربہ ہے کہ انسان اپنے حال سے پناہ لے کر کبھی کبھار ماضی کی یادوں میں The trip to Hong Kong۔ بلا تامل جم بولا Not bad! اور پھر اس نے اپنے سفر کی تمام تر تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔ ایک بات البتہ تشویش ناک تھی جم نے کہا کہ ہانگ کانگ میں مقیم کینیڈا کے سفارت خانے کے سٹاف کے جو لوگ Yacht Club کی ماہانہ رکنیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اب اس میں 80 % اضافہ ہو گیا ہے۔ Oh What a Shame چ چ یہ تو بہت برا ہوا۔ بیچارے ڈپلومیٹ! یہ ماہانہ فیس کی ادائیگی بھی خوب چیز ہے۔ ہر ماہ سکول میں فیس جمع کروایئے، بل ادا کیجیے اور جانے کیا کیا کچھ! ذرا سوچیے کہ اب ہانگ کانگ میں اگر کشتی کی سیر کو جی چاہے تو............ نہ جانے اسے کیوں اچانک خیال آیا کہ اب سے کئی سال پہلے اس کے چھوٹے سے گاؤں میں ماسی بھاگ بھری کو ہر ماہ اپنے بیٹے اعظم کے سکول کی ماہانہ فیس جو شاید ایک روپیہ تھی، کی ادائیگی کے لئے محنت کرنا پڑتی تھی۔ دنیا کے اس وسیع کینوس پر بکھرے ہوئے ان گنت مسائل کتنے رنگا رنگ اور مختلف ہیں۔ اچانک وہ بس اسٹاپ آ گیا۔

Air Canada کا دفتر اور وہ جلدی سے نیچے اترا۔ مختلف کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خواتین بہت ہی تیزی سے کمپیوٹر پر اپنی انگلیاں چلا رہی تھیں۔ انتظار گاہ کے حصے میں اس نے یونہی مختلف Vacations کے اشتہارات دیکھنے شروع کر دیے۔ نمبر 27 بہت جلدی باری آ گئی۔ نمبر بھی تو مشینوں سے نکلتے ہیں۔ فٹافٹ، بلاتاخیر۔ اسے بہت تعجب سا ہوا۔ یہ عجیب لوگ ہیں، کیسی مخلوق ہے! لیزا شاید یہی اس لڑکی کا نام تھا، اسے کیا معلوم، ارے ہاں ابھی تو اس کی دوسری Colleague نے پوچھا تھا! "لیزا تم لنچ بریک پر کب جا رہی ہو" پھر وہی لنچ بریک! یوں لگتا ہے جیسے سارا شہر اسی بریک کے چکر میں ہے۔ اوں یہ کون سا طریقہ ہے ٹکٹ بیچنے کا! اوہ! وہ، شکاگو، ٹوکیو، سنگاپور! باپ رے باپ اتنا دور۔ دنیا کا دوسرا سرا۔ پھر وہ اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ مگر بہت پہلے تو جب وہ دو میل پیدل چل کر قریبی ریلوے سٹیشن پر جاتا تھا بس یونہی کبھی لاہور شہر جانے کا پروگرام بن جائے مگر اتنا کرایہ کس کے پاس کہ بار بار لاہور جائے............ وہ تو بات ہی کچھ اور تھی۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب باہر بیٹھے دھوپ میں اردو کا کوئی اخبار دیکھ رہے ہوتے اور اپنے تمام عملے کو جو چند قلیوں سمیت پانچ افراد پر مشتمل تھا سیاست کی اونچ نیچ پر فکر انگیز لیکچر دے رہے ہوتے ٹکٹ چاہیے بیٹا! پھر لاہور جا رہے ہو! اور پھر وہ گاؤں کے ہر فرد کی خیریت معلوم کرتے۔ کس کو بخار ہوا، کون فوج سے چھٹی لے کر کتنے عرصے کے لئے گاؤں آیا............ بیٹا! یہ بیٹا کیا ہوا؟ یہاں اس بڑے شہر میں تو کبھی کوئی اس طرح نہیں پکارتا! بھائی کہاں جا رہے ہو؟ سنگاپور! لیزا ہے، کمپیوٹر ہے، صاف ستھرے منظم دفتر، دیواروں پر خوبصورت پوسٹر۔ مگر جی وہاں سفر ہی کون کرتا ہے۔ گاؤں سے پیدل چلو صبح صبح۔ اپنے دوستوں کے ساتھ اور تب یوں لگتا تھا کہ اگر اپنی تختی کو اچھی طرح سے نہیں دھویا اور اس پر خوب تہ در تہ "گاچی" نہیں لگائی اور پھر پنسل سے لکیریں نہیں لگائیں تو ماسٹر اکبر سے خوب پٹائی ہو گی۔ جب بھی کبھی اس سے کوتاہی ہوتی تو اس کا پھوپھی زاد بھائی اسلم اس کی مدد کر دیتا۔ وہ رشتے بھی عجیب تھے۔ مگر یہ Word Processor میں سب کچھ خود بخود ہی ہو جاتا

ہے۔ یہ ہوئی ناں بات! نہ تختی، گاچی نہ پنسل کی لکیریں۔

لیزا نے سارا کام ختم بھی کر لیا تھا۔ باقی سب کچھ تو ٹھیک ہی تھا۔ لیزا تیزی سے بتاتی جارہی تھی۔ Over night stay in Tokyo، ایئر لائن کے خرچ پر، ہوٹل ایئر پورٹ سے قریب ہے، ناشتہ اور لنچ سب مفت، اس کے بعد چھ گھنٹے کی مزید پرواز، ٹوکیو سے سنگاپور۔ Flight Non Stop Direct۔ اتنا لمبا سفر اور بس 20 گھنٹے میں سب ختم! کمال ہو گیا ہے۔ سنگاپور میں ایک سائنسی ورکشاپ تھی جسے UNESCO نے سپانسر کیا تھا۔ اقوام متحدہ کا سائنسی، تعلیمی اور ثقافتی ادارہ ہے۔ یہ "اقوام متحدہ" خوب چیز ہے۔ قوموں کو خوب متحد رکھتی ہے، جہاں کہیں کوئی مسئلہ ہوا، تصفیے کے لئے موجود پر اب سے بہت پہلے اس چھوٹے سے گاؤں میں تو ایسی کوئی............لوگ جاہل تھے، شاید ان پڑھ، بس اپنے حقوق سے بے خبر............کسی سے جھگڑا ہی نہیں کرتے تھے۔ Is that O.K Sir۔ لیزا نے اکتائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"I am sorry, but you have to break journey"۔ مگر ٹوکیو کا ایئر پورٹ بہت اچھا ہے۔ ڈیوٹی فری شاپ ہے۔" وہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔

"اوں بالکل ٹھیک ہے۔" ان تیز رفتار طیاروں نے جغرافیائی فاصلوں کو تو ختم ہی کر دیا ہے۔ شہر اور ملک ایک دوسرے سے کتنے قریب ہو گئے ہیں۔ ناشتہ ٹوکیو میں اور شام کا کھانا، دوپہر کی چائے سنگاپور میں! اس نے کاغذ پر ٹائپ کی ہوئی اپنی Itinerary کو سنبھالا۔ پر یہ کیا خوب چیز ہے، تمام تفصیلات موجود۔

وہ پھر اپنے دفتر واپسی کے لئے تین نمبر بس میں سوار ہو گیا۔ شہر میں وہی رونق اور وہی گہما گہمی تھی۔ سامنے نیشنل آرٹ سنٹر کی عمارت تھی۔ ڈراموں کی نئی سیریز دو ہفتے بعد شروع ہو رہی ہے۔ ایڈوانس بکنگ کروا لینی چاہیے، بعد میں ٹکٹ ہی نہیں ملتے۔ وہ چپ چاپ ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ مسافر پھر اپنے اپنے مسائل کا ذکر کر رہے تھے، شاید کسی اور سوسائٹی............مگر اچانک اسے یوں لگا کہ یہ سب کچھ شاید بے کار کی باتیں ہیں۔ اختر الایمان کی نظم اسے بے حد پسند تھی۔ وہ لڑکا پوچھتا ہے............اس شہر میں یہ نظم کہاں سے یاد آ گئی۔ کل شام تو سنگاپور بھی جانا ہے اور پھر ٹوکیو میں Break, Journey بھی تو کرنا ہو گی۔ ایک ہلکی اور معنی خیز مسکراہٹ جانے کہاں سے اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اب سے بہت سال پہلے بھی تو گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جب وہ سکول سے پیدل واپس اپنے گاؤں جاتا تھا تو راستے میں اپنے دوست یعقوب کے گھر پر رکتا تھا اور پھر ریت کے تھڑے پر سے گھڑے سے ایک گول مٹی کے پیالے میں خوب جی بھر کر گاؤں کے کنویں کا ٹھنڈا پانی پیتا اور ہفتے میں ایک بار وہ لوگ اسے اصرار سے روک لیتے "سرسوں کا ساگ پکایا ہے، مسی روٹی کھاؤ گے مکھن کے ساتھ۔"

اور اب تو ٹوکیو کے ایئر پورٹ کا ناشتہ اور لنچ ہو گا۔ باقاعدہ ویٹر، خوبصورت گول میز، پس منظر میں ہلکی ہلکی جاپانی موسیقی، کانٹے اور چھریاں (غلط لفظ سوچ لیا خوامخواہ! اصل لفظ Forks Knives and ہے)

ایک دن اور ایک رات بس! اوٹاوہ سے سنگاپور اور وہ بھی Break Journey کے ساتھ! اتنا طویل فاصلہ اتنے کم وقت میں۔ ہوائی سفر نے تو واقعی لوگوں کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا ہے۔ "یہ قربتیں، وہ فاصلے"۔ پہلے تو ریل گاڑی میں بھی لاہور جانا ہوتو......

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ پھر وزارت خارجہ کے دفتر کے سامنے آ گیا ہے۔ لوگ بہت ہی جلدی میں اپنی اپنی فائلیں سنبھال کر تیزی سے بس سے اتر رہے تھے۔ گفتگو جاری تھی، لنچ بریک ختم ہو چکا تھا۔ بعض سیکرٹریز اپنے Boss کے خوف سے بھاگتی ہوئی جا رہی تھیں۔ کتنی رونق ہے، یہ سب لوگ کتنے مصروف ہیں۔

سڑک پار کرنے کے لئے وہ ٹریفک ختم ہونے کا منتظر تھا۔ اچانک بلا سوچے سمجھے جانے کیوں اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "وہ قربتیں، یہ فاصلے"............اسے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ اس کا پولش ساتھی اس کے بالکل پاس کھڑا ہے۔ اس کی آواز سن کر اس کے ساتھی نے کہا۔

.....PARDON, What did you say"

وہ کیا جواب دیتا۔

"Nothing sorry."

یونہی میں اپنے آپ سے بات کر رہا تھا۔

اور اب کئی سال بعد بھی وہ کبھی کبھار سوچتا ہے کہ کیا واقعی سچ مچ "I said nothing!"

افسانہ

حیرت و مستی

ڈاکٹر فوزیہ تبسم/لاہور

آج اُس کی پھر فون پر بات ہوئی تھی اور وہ بے حد خوش تھا۔ خوش بھی کیوں نہ ہوتا، اُس کا برسوں کا خواب پورا ہو رہا تھا۔ ۵۶ سالہ زندگی نے اُسے کچھ بھی تو نہیں دیا تھا۔ وہ تھا اور اُس کی تنہائی تھی۔ اس تنہائی سے بچنے کے لیے اُس نے چند گھنٹوں کی نوکری پال رکھی تھی جس سے اُس کا سٹیٹس (Status) بھی برقرار تھا اور مالی حالات بھی قابو میں تھے اور وہ تن تنہا کمرے میں بیٹھے بھی تو کیوں......؟

اُسے معلوم تھا کہ اُس پر بڑھاپا دن بدن سوار ہو رہا ہے۔ دوسری طرف اس کی ماضی کی تلخ یادیں اُس کا پیچھا کرتیں اس کے کمرے میں آن بسیرا کرتیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی صحت بھی اچھی نہ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی صحت کے بارے میں فکرمند ہی رہتا۔

کئی سال بعد آج اُس کے لبوں پر نغمے مچل رہے تھے۔ اُس کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا، وہ نئی نویلی دلہن کا سراپا پلکوں میں سجائے بیٹھا تھا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا وہ نوجوان امیچور (Immature) لڑکوں کی طرح فون کی گھنٹی مارے اور اسے I Love u کہے اور کہتا رہے۔

اور پھر ایسا دن آئے جب وہ دلہن بنی اُس کے سامنے بیٹھی ہو اور وہ اسے مسلسل دیکھتا رہے۔ وہ تو ہے ہی تخلیقی ذہن کی حامل خاتون، جس کی اُسے تمنا تھی۔ بیوی ہو تو ایسی۔ وہ رات کے اندھیروں میں ٹیبل لیمپ کی روشنی میں بہت کچھ تخلیق کرے اور میں دن رات اُس کی خدمت کروں۔ اس کے ہاتھ چوموں اُس کے ماتھے پر بار بار بوسہ دوں اور کہوں تم لکھو اور لکھتی جاؤ۔ اپنے ذہن کے در کھولتی جاؤ آسمانوں کو چھوتی جاؤ اور میں۔ میں بندۂ بے دام کی طرح تمہاری خدمت پر کمربستہ رہوں۔ کیونکہ یہ میرا خواب تھا۔ میری چاہت تھی۔ میری بیوی ہو تو بس Creative mind خوبصورتی کو اس نے کبھی نمبر نہیں دیے تھے۔ کیونکہ اُس کی پہلی بیوی بہت خوبصورت تھی اور پھر اسے اپنی بیوی کے ساتھ چار عدد بچے بھی یاد آنے لگے۔ وہ اپنا ذہن جھٹکنے لگا۔ نہیں میرا وہ خواب ادھورا رہا۔ میں مر مر کے جیا کیونکہ اُس خوبصورت عورت سے بات کرتے ہوئے مجھے اپنے سٹیٹس (Status) سے بہت نیچے آنا پڑتا تھا۔ میں بڑا افسر ہونے کے باوجود ایک جاہل حسینہ سے کیا بات کرتا؟ وہ مجھے سمجھ نہ پائی تھی اور اُس کی ۵۶ سالہ زندگی بے کار، بالکل بے مصرف گزر گئی اور اس سے پہلے کہ وہ آہ بھرتا اُس نے اپنے دماغ کو جھٹکا دیا۔ اب وہ دل میں برپا شور غور سے سن سکتا تھا۔ وہ میری زندگی کا قیمتی لمحہ ہوگا جب وہ لاہور آئے گی۔ مجھ سے ملے گی۔ میں اُس کا استقبال کیسے کروں گا؟ مجھے ابھی سے پلاننگ کرنی ہے۔ اُس کے لیے بیڈ روم میں اہتمام کرنا ہے۔ اس کا ہر لمحہ میرا ہوگا اور میرا ہر لمحہ اُس کا ہوگا اور پھر......

آج وہ اپنے بیڈ پر بے چین و بے قرار انگڑائیاں لے رہا تھا۔ وقت تھم گیا تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور اُس کی گونجتی ہوئی مترنم آواز۔ اُس کا کلام کانوں میں رس گھول رہا تھا۔

اس قدر رشتہ آواز، اس قدر خوبصورت لب ولہجہ۔ قربان ہو جانے کو جی چاہے۔ کتنی دُکھی ہے وہ، اُس کے کلام اور اُس کی آواز میں یہ چاشنی، اس کے کرب کے محسوسات اُسے جوان کیے ہوئے ہیں۔ اس قدر خوبصورت لکھنے والا انسان خوبصورت ہی ہو سکتا ہے۔ اس کا سراپا اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا وہ ملے گی اور میں اُسے اپنے سینے سے لگا لوں گا اور کہوں گا۔ آج اپنے سب غم بھول جاؤ۔ اپنا شوہر اپنے بچے بھول جاؤ کیونکہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم میرے ساتھ ہو۔ میں خود کو تمہارا غلام بن کر دکھاؤں گا۔ پھر وہ اپنے آپ سے ہم کلام ہوا اور کہنے لگا۔ نہیں نہیں یہ غلامی اور بادشاہی کو چھوڑو۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح زندگی گزاریں گے۔ ایک دوسرے کے پکے دوست بن جائیں گے۔ اب وہ ان دائروں میں گھومنے لگا تھا۔ وہ بے بس تھا کیونکہ رخشندہ اس سے بہت دور تھی۔ بہت

دور...... آج صبح اُٹھتے ہی اس نے موبائل پر اُسے Bell دی تھی اور اُس نے اُسے sms کیا تھا جس میں خوبصورت شعر لکھا تھا۔

وہ بلا کی ذہین عورت تھی۔ اس نے خاور کو چاروں شانے چت گرا لیا تھا۔ اپنا دیوانہ بنا لیا تھا۔ وہ لمحہ لمحہ اُس کی کمی محسوس کرتا اور بار بار اُسے فون کرتا۔ جب کارڈ ختم ہونے کا خیال آتا sms کرنے شروع کر دیتا مگر اُس کے دل کو پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔

رخشندہ بہت پریشان تھی۔ اس لیے اس نے آج اُسے فون کیا تھا۔ ''میں بے قرار اور بے چین ہوں، آپ سے ملنے کے لیے۔ مگر میرے معاشی حالات کچھ ایسے ہیں کہ میں آپ سے مل نہیں سکتی......!''

خاور بے چین ہو گیا تھا اور ملنے کی چاہ کرنے لگا تھا۔ آج ساری رات اُس نے رخشندہ کو Busy رکھا تھا۔ اُسے بھی رُلایا تھا اور خود بھی رویا تھا۔

آج سارا دن وہ نیند سے بے حال رہا تھا۔ رات کا جاگنا اُسے مہنگا پڑا تھا مگر وہ کیا کرتا اُس کی محبوبہ نے اسے یاد کیا تھا اور اسے وقت دیا تھا۔ ابھی تو عہد و پیمان ہی تھے اور اگر وہ ان میں پورا نہ اُترتا تو ہوسکتا ہے وہ اسے نااہل کہہ کر فارغ کر دیتی۔ سو یہ وقت جو اس نے اسے دیا تھا، بے کار نہیں دیا تھا۔ اس کے کچھ معنی تھے اور وہ تھے کہ جب جہاں پکارو گی، میں فوراً وہاں پہنچ جاؤں گا۔ ان قیمتی لمحوں کو کھینچتے کھینچتے ایک سال ہو چلا تھا۔ اب اُس کے فون آنے کے ساتھ ساتھ خط و کتابت بھی شروع ہو چکی تھی۔ اُس کے خطوط کے پیراگراف ایسے تھے کہ دل زخمی ہو جاتا، وہ زخمی شیر کی طرح جلد از جلد اُسے پانے کی تمنا کرنے لگا تھا۔

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ آج اُٹھا اور سیدھا Booking office گیا۔ اُس نے کوئٹہ کی دو طرفہ ٹکٹ لی اور اُسے روانہ کر دی۔ ان لفظوں کے ساتھ کہ ''میں اب اور انتظار نہیں کر سکتا۔ میں بھی ٹوٹے اور بکھرے ہوئے راستوں کا مسافر ہوں اور تم بھی بکھرے ہوئے جذبوں کی دیوی ہو اور مجھے ہر قیمت پر قبول ہو!''

آج اس کی آمد کا دن تھا اور اس کے بننے سنورنے کا دن تھا۔ اُس نے سب سے بہترین سوٹ پہنا تھا جس کی اس کے گھر کی خواتین جہاں وہ قیام پذیر تھا عموماً تعریفیں کرتیں۔ اب وہ اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ یہ سوٹ یقیناً اس کی سمارٹ نیس (Smartness) کا راز ہے۔ اُس کے ساتھ میچنگ (Maching) ٹائی لگائی تھی۔ وہ تیار ہو کر چالیس سال کے بھی کم کا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ خوش تھا، کیونکہ آج ملن تھا۔ آج وہ سوچ رواں میں تھا۔ اُس کا انگ انگ سرشار تھا۔ محبت سے۔ کسی کی چاہت سے آج وصال تھا۔ ایک پورے سال کے بعد اس کا وصال۔ وہ سوچ رہا تھا ایک سال بھی ایک صدی پر محیط تھا۔ کاش وہ لمحہ آ جائے اور اپنے خوابوں کی شہزادی کو گلے سے لگائے اور پھر بڑی تقریب میں اُس کا ہاتھ ہمیشہ کے لیے تھام لے اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے اُس کی ہو گی۔ کوئی ہجر نہ ہوگا، بس وصال ہوگا۔ وصال......

گھر کی تمام خواتین اور مرد جن کا وہ Paying guest تھا۔ اس سے محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ انہوں نے کھانے کا بندوبست اپنے ذمے لیا تھا۔ اس کا کمرہ پھولوں سے معطر تھا۔ مالک مکان کی بچیوں نے گھر کو دلہن کی طرح سجا دیا تھا۔ خاص طور پر خاور کا کمرہ گھر میں سب سے زیادہ مہک رہا تھا۔ آخر کو اس نے اس گھر کی بہو رانی بننا تھا۔ پورے گھر کی نہ سہی خاور کے دل کی رانی تو وہ تھی ہی......

اب وہ ایئرپورٹ پر کھڑا کوئٹہ کی پرواز کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن بھی کم اور کبھی زیادہ ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ دل کی اس زور دار دھڑکن پر خود بخود ہنسنے لگتا اور ڈر جاتا۔ نجانے کیوں یہ دل صبح سے دھڑک رہا ہے یا یہ عمر کا تقاضا تھا کہ دل بے قابو تھا اور ان لمحوں میں اس کو بلڈ پریشر کے بے قابو ہونے کا گمان ہو رہا تھا مگر وہ پھر اپنے ذہن کو جھٹک رہا تھا۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اُسے ابھی تک کوئی ایسا قابل توجہ شخص پوری پرواز میں نظر نہ آیا تھا جس کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ کئی مسافر گزرے اور اپنے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ چلتے بنے۔ وہ اپنے ہاتھ میں اُس کے نام کا کارڈ لیے کھڑا تھا اور کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا کہ ایک انتہائی خوف ناک شکل کی کالی عورت اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ جس کا اس کو جنم جنم سے انتظار تھا۔ اُس نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور یوں گویا ہوئی تھی۔

''خاور تم نقصان میں رہے اور میں فائدے

میں۔ تمہیں مجھے دیکھ کر افسوس ہوا ہوگا مگر میں تم سے عشق کرتی ہوں، میں تمہاری پوجا کرتی ہوں۔ میں تمہاری پجارن ہوں۔ تم تخلیقی ذہن کے انسان ہو اور میں بھی۔ دونوں مل کر اپنی دنیا کو جنت بنائیں گے۔ نئی دنیا بسائیں گے...... خاور...... خاور!''

خاور دم بخود تھا اس کے تمام خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ رہی سہی کسر اس کے جسم سے آنے والی بدبو تھی، جو وہ چمکتی چمکتی نئی گاڑی چلاتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ کیا ایسا ممکن ہے۔ اس قدر خوبصورت گفتگو کرنے والی...... اس قدر خوبصورت تحریریں لکھنے والی...... کیا اس قدر بدبودار، اس قدر بھیانک ہو سکتی ہے؟ اس کے کالے ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھے اور وہ اپنے ہاتھوں کو اس کی ہلکی ہلکی جنبش سے آزاد کرنا چاہتا تھا۔ اُسے اپنی خوبصورتی پر اترانا آ گیا تھا۔ اب گیند اس کے کورٹ میں تھی اور اس نے فیصلہ کرنا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کیا منہ لے کر گھر جائے؟ جہاں سب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اُس نے گاڑی پہلے سے آہستہ کر دی تھی۔ اُس کے گھر کی خواتین اپنے دوسرے دوستوں کو بھی بلانے کے لیے فون کر رہی تھیں تاکہ اس کے استقبال میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ آخر وہ کئی برس سے وہاں مقیم تھا۔

اس نے پٹرول ڈلوانے کے بہانے گاڑی کو یک دم بریک لگائی اور وہ اب سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے موبائل جیب سے نکالا۔ اپنا پسینہ اپنے کوٹ کے بازو سے صاف کیا۔ اب اُسے لگ رہا تھا کہ اُس کا بلڈ پریشر اپنی آخری حد کو پہنچ چکا ہے۔ اس نے موقع غنیمت جان کر گھر فون ملایا اور سب کو یہ اطلاع دی کہ زیادہ لوگ اکٹھے نہ کیے جائیں۔ درحقیقت میرا اور اس کا Level وہ نہیں جو سوچا تھا۔ بس میرا خیال ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے اور اُس نے فون بند کر دیا تھا۔ پٹرول کی ادائیگی کرنے کے بعد اب وہ سکون سے گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ اُسے خوشی یہ تھی کہ اُس نے گھر میں پہلے سے اطلاع دے دی۔ اب وہ کچھ پُرسکون ہوا۔ اپنا پسینہ پھر صاف کیا......

وہ غور سے خاور کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اب اُس کی محبت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح سے اُس کو دیکھنا چاہ رہی تھی۔ اُس نے برملا کہا ''خاور تم بہت (Smart) سمارٹ اور (Handsum) ہینڈسم ہو اور میں بہت خوش قسمت، جس کو تم جیسا شخص ملا۔ تم ہی میرے آئیڈیل ہو۔ میں تمہارے لیے اپنا شہر، اپنے بچے، سب کچھ چھوڑ آئی ہوں۔ میں کشتیاں جلا آئی ہوں، تم خوش تو ہو ناں......؟''

خاور کھسیانہ ہوا جا رہا تھا مگر اُس نے صبر کا دامن نہ چھوڑا۔ اُس کو فون پر کیے عہد و پیمان ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے۔

وہ گھر کی دہلیز پر تھا۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ دروازہ کھلا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ چپکے سے اُسے اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ وہ اسے بیڈ پر بٹھا رہا تھا۔ کھانا بھی اُس نے وہیں کھا لیا تھا۔

وہ دیوی تھی۔ پیار کی دیوی۔ اس نے اپنی چادر اُتار دی تھی اور اب وہ اس پر اپنا پیار نچھاور کرنا چاہ رہی تھی۔ اس کے تمام حرف جن کو وہ بناتی سنوارتی تھی آج بے لبادہ ہو چکے تھے۔ وہ اپنے صنم کی، اپنے خدا کی پوجا کر رہی تھی۔ وہ بے خود ہو چکی تھی۔ بے آپے ہو چکی تھی۔ اپنی زندگی کی تمام تلخیاں وہ آج مٹانا چاہتی تھی۔ خاور اب کب تک اس محبت کو نفرت میں بدلتا۔ محبت جیسے ملے، جہاں سے ملے انسان کا حق ہے اور خاور بے خود پڑا تھا۔ کمرہ پھولوں کی خوشبو کی بجائے اُس عورت کے جسم کی بدبو سے بھرا ہوا تھا۔ اُس کو زندگی نے جو کچھ دیا تھا شاید اُس کو اس کی جزا ملی تھی یا سزا؟ وہ سوچ رہا تھا......!

ملک کی مایہ ناز اسکالر بشریٰ شیریں کا مقالہ

اُردو غزل کا فلسفیانہ پس منظر

شائع ہو گیا ہے

قیمت: -/350 روپے

ناشر: **دی رائٹرز**

اے زی بک سنٹر، شاہ کمال روڈ، راواں

رحمان پورہ، لاہور

0300-4972079 0300-4972314

رخِ ایام سے ماضی کی ادا مانگتا ہے
دل کہ اب تک تیرے ملنے کی دعا مانگتا ہے

احمد حماد

افسانہ

پکنک، روٹی اور عشق

دستگیر شہزاد

آپ چھانگا مانگا تو ضرور گئے ہوں گے۔ لیکن اگر آپ جنگل کی سیر کر کے ہی لوٹ آئے ہیں تو آپ نہیں سمجھ سکتے کہ چھانگا مانگا میں صرف جنگل ہی نہیں، آبی جھیل بھی ہے اور صبح کی ہلکی دھوپ میں جھیل میں بوٹنگ کرنے کا جو لطف ہے وہ جنگل کو دیکھنے کا نہیں۔ یہ راز کچھ ہم جیسے قدردان ہی سمجھ سکتے ہیں جو دور دراز علاقوں سے اس آبی جھیل پر آتے ہیں اور آتے بھی ذرا فرصت سے ہیں۔ میرا مطلب ہے روزگار کے تھکے دھندوں سے بے فکر ہو کر آتے ہیں۔ پہلی بار جب میں جھیل دیکھنے گیا تو میرے ساتھ میری منی ٹیوٹا کرولا کار تھی اور اس میں تین لڑکیاں تھیں۔ میری محبوبہ سارہ جو اگلی سیٹ پر اپنا سر میرے کندھوں سے لگائے بیٹھی تھی اور اپنے کٹے ہوئے بال بار بار میرے منہ پر جھٹکتی تھی اور پچھلی سیٹ پر اس کی دو سہیلیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔

چھانگا مانگا چیک پوسٹ پر ہمیں رکنا پڑا۔ جہاں سے دو کلومیٹر لمبی ٹوٹی پھوٹی سڑک جھیل کو جاتی ہے۔ رکنا اس لیے پڑا کیونکہ وہ ٹوٹی پھوٹی سڑک زیر تعمیر تھی اور جھیل کو جانے والا راستہ بیریل سے بند تھا اور جو سنتری وہاں کھڑا تھا وہ بیریل اٹھانے کے موڈ میں بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے ہارن بجایا۔ پھر میری رفیقوں نے کار میں سے اپنی گوری گوری مرمری بانہیں زور زور سے ہلائیں۔ ایسی بانہیں جنہیں دیکھ کر خود فرشتے بیریل اٹھانے آ جائیں لیکن یہ سنتری کسی بہت گھٹیا مٹی کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہار کر میں باہر نکلا اور چوہدرانہ چال چلتا چیک پوسٹ کے بیریل تک گیا۔ بڑے رعب سے میں نے کہا۔

''اے تم بیریل کیوں نہیں اٹھاتے؟''

سنتری بولا۔ آپ وی آئی پی ہیں۔

میں نے کہا ''وہ کیا ہوتا ہے''

سنتری بادشاہ میری ناسمجھی پر پہلے تو ہنسا پھر بولا۔ آپ منسٹر ہیں؟

میں نے کہا۔ نہیں

اسمبلی کے ممبر ہیں؟

نہیں

بڑا صاحب ہیں؟

ابھی تو نہیں۔

سنتری بولا۔ تم منسٹر نہیں۔ اسمبلی کا ممبر نہیں، بڑا صاحب نہیں تو تم کیا چیز ہے؟

سنتری کا اس طرح آپ سے تم پر اترنا میری غیرت کو چیلنج تھا۔ ٹائی کا زاویہ درست کر کے اور کوٹ کو کھینچ کر سنوارتے اور اپنی چھاتی پھیلاتے ہوئے زہر آلود نظروں سے سنتری کو چھیدتے ہوئے میں نے کہا۔

میں وسطی پنجاب کے ایک بڑے زمیندار کا صاحبزادہ ہوں اور یہ مری منی ٹیوٹا کرولا کار ہے۔

میرا یہ خیال کہ سنتری گھٹنے ٹیک دے گا۔ غلط نکلا۔

وہ برعکس اس کے ایک طنز آمیز مسکراہٹ سے مسکرایا۔ وہ ایسی مسکراہٹ سے اس وقت مسکراتا تھا جب کوئی وی آئی پی نہ ہوتا ہوا بھی خود کو وی آئی پی ثابت کرنے کی کوشش کرے۔

اس خبر کو کہ کار وہیں چھوڑ کے نہر کے ساتھ ساتھ باقی راستہ پیدل چلنا ہوگا۔ لڑکیوں کی طرف سے کوئی پرجوش استقبال نہ ملا۔

سیپ جیسے ہونٹوں کو اپنی سب سے دل کش ادا سے کھولتی ہوئی سارہ بولی ہائے میں مر گئی۔

میں نے کہا۔ ڈارلنگ۔ یہ ہائے وائے بعد میں کرنا اور مرتے بھی بعد میں رہنا پہلے یہ کھانے پینے کا سامان اٹھا کر دو کلومیٹر پیدل چلنے کے لیے کمر باندھو۔

سارہ بڑی سنجیدگی سے بولی۔ تو کیا وہ واقعی جھیل تک پہنچنے کے لئے کوئی اور متبادل راستہ موجود نہیں؟

میں نے کہا۔ نہیں اور کوئی راستہ نہیں۔ اگر یہ سنتری کا بچہ آپ تینوں میں سے کسی ایک پر عاشق ہو جائے تو الگ بات ہے، یوں کوئی چارہ نہیں۔

وہ تینوں ایک ساتھ بولیں۔ ''یو شٹ اپ''

پھر کچھ ٹھٹکتی کچھ مچلتی سارہ بولی:

چلو ڈارلنگ۔ واپس چلیں۔ آج پھر جنگل ہی دیکھ لیتے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس میں کھانا کھا کر واپس چلے جائیں گے۔ میں نے دوسری دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ جس کا نام فاریہ تھا۔ اس کے انداز میں فلسفیوں جیسی بے پروائی تھی کہ کار ہے تو ہے نہیں تو نہ سہی۔ کرولا تو کرولا نہیں تو پیدل ہی سہی۔ لیکن وہ دوسری لڑکی جو گول مٹول اور گدگدی سی تھی اور جس کا نام عروسہ تھا۔ وہ اسکارف سنوارتی ہوئی اور پرس میں سے گلاسز نکال کر لگاتے ہوئے بڑے جوش سے بولی۔

میں کہتی ہوں بلکہ یہ تو اچھا ہوا۔ وہ پکنک ہی

کیا جہاں چار قدم پیدل نہ چلنا پڑے۔ اور پھر سارہ کے بجھے ہوئے انداز دیکھ کر بولی۔

لائف میں کچھ ایڈونچر بھی ہونا چاہیے۔

ایک ایک تھرمس اپنے کندھوں سے لٹکائے اور پرس اٹھائے وہ تینوں آگے پیچھے جا رہی تھیں۔ اور ایک لدی ہوئی خچر کی طرح میں ان کے پیچھے ہانپتا اور لڑھکتا ہوا جا رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں ہینڈل والی دو بید کی ٹوکریاں تھیں۔ اور ایک میں کراکری اور دوسری میں کھانے پینے کے سامان کے ڈبے، اسٹوو اور ساس پین تھے۔ دو تھرمس میرے کاندھوں پر لٹک رہے تھے اور میری پیٹھ پر گول کی ہوئی دو چٹائیاں تھیں۔ تین مس صاحبان کے پیچھے میں ایک پنجابی نوکر مصاحبان کی تفریح کے سامان سے لدا پھندا ٹھوکریں کھاتا ہوا چل رہا تھا ابھی بمشکل دو فرلانگ گئے ہوں گے کہ قمیض اور کوٹ پسینہ میں تر ہو کر میری پشت کے ساتھ چپک گئے۔

اور مجھے ان مزدوروں سے حسد ہونے لگا جو منوں بوجھ اٹھائے بآسانی سیدھی سپاٹ چڑھائیاں چڑھ جاتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے کوٹ اور پتلون نہیں پہنا ہوتا۔ پیٹھ عام طور پر ننگی ہوتی ہے، یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ گھسا ہوا کرتہ پہنا ہوتا ہے، اس طرح کون بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ کبھی وہ کوٹ پتلون پہن کر یہ سامان اٹھا کر دکھائیں جو کبھی دن میں تارے نہ نظر آ جائیں اور مجھے واقعی دن میں تارے نظر آ رہے تھے۔ اور تیزابی پسینہ جو میرے بالوں سے بہہ نکلا تھا میرے منہ کا ذائقہ بگاڑ رہا تھا۔ جو چیز مجھے سب سے زیادہ ستا رہی تھی وہ عروسہ کی گوری اور سڈول پنڈلیاں اور گلابی رنگ کی چست جینز میں لٹکتے ہوئے پرس کی گولائیاں تھیں۔ اب مجھے سمجھ آئی کہ عروسہ نے پیدل چلنے کے لئے کیوں اتنا جوش دکھایا تھا۔ گولائیوں کی اس طویل نمائش سے وہ میرے دل کو جلانا چاہتی تھی۔ میرے جگر کو کباب کرنا چاہتی تھی۔ اور آخر وہ دو کلومیٹر میرا مطلب ہے دو ہزار کلومیٹر کا سفر ختم ہو گیا۔

اس دن فاصلے کے متعلق میرے اندازوں میں ایک انقلاب آیا تھا۔

مجھے اس دن پتہ چلا تھا کہ دو ہزار کلومیٹر کا مطلب دو کلومیٹر ہے۔ یہ نہیں کہ ایسی لیٹر پر پاؤں رکھا۔ ٹائی کی ناٹ ٹھیک کی اور دو کلومیٹر گزر گیا۔ رومال نکال کر ذرا سا منہ پر پھیرا ایک کلومیٹر اور گزر گیا۔ ہاتھ سارہ کی کمر میں ڈالے اور بیک وقت کتنے کلومیٹر یک لخت گزر گئے۔

جھیل پر پہنچ کر کوئی آدھا گھنٹہ مجھے پکنک کے موڈ میں آتے ہوئے لگا۔

ٹائی اور بوٹ میں نے کھول دیئے کوٹ اور قمیض اتار کر وہ چینکی پتلون کے پائنچے چڑھا کر پیر جھیل کے پانی میں لٹکا دیے اور جھیل کی جانب سے آتی ٹھنڈی ہوا کی کنگھی اپنے پسینہ میں سے شرابور بالوں میں چلنے دی اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں کرائے کا قلعی نہیں بلکہ صاحب زادہ ہوں تو میں نے جھیل کے چاروں طرف اچھی طرح سے دیکھا اور مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ہمارے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ چاروں طرف تنہائی تھی یا ہم تھے۔ اگر جہاز بحرالکاہل میں ڈوب گیا ہوتا اور مسافروں میں سے صرف ہم چاروں کسی ویران جزیرہ میں پہنچ گئے ہوتے تو بھی اس سے زیادہ تنہائی ہمیں نصیب نہ ہوتی۔ تین خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ اس قدر مکمل تنہائی کا احساس میرے دل میں گدگدی کرنے لگا اور میرا جی چاہا کہ انسانی خاصہ چھوڑ کے زور زور سے ہنہناؤں اور دولتی جھاڑوں لیکن میں نے صرف منہ سے سیٹی بجانے پر ہی قناعت کی۔ سیٹی میں تب بجاتا ہوں جب بے حد خوش ہوتا ہوں۔ سارہ بھی بے حد خوش تھی کیونکہ وہ میری محبوبہ تھی اور فاریہ اور عروسہ بھی بے حد خوش تھیں کیونکہ جیسا کہ ظاہر تھا گو ان کو چاہنے والے ابھی تک انہیں نہیں ملے تھے لیکن آپ جانتے ہیں کہ ب تک لڑکیاں اپنی سہیلیوں کے عاشقوں کے ساتھ ہی ہنس کھیل کہ اپنے دل کے ارمان پورے کر لیتی ہیں۔

بڑی دیر تک ہم بوٹنگ کرتے رہے۔ جھیل کا پانی ایک دوسرے پر اچھالتے رہے اور یہ آسمان پر اڑتی ہوئی مرغابیوں کی صحیح مقدار معلوم کرنے کی شرطیں لگاتے رہے۔ جب جھیل کے شفاف اور بے کنار پس منظر میں میں نے پہلی بار فاریہ کو مسکراتے دیکھا تو میں نے کہا یہ مسکراہٹ ہے یا معجزہ۔ ایسی مسکراہٹ کو دیکھ کر تو اچھا بھلا آدمی بھی شاعر بن جائے۔ ایسی مسکراہٹ کا سہارا مل جائے تو ساری زندگی اسی کے سہارے کٹ سکتی ہے۔ اس لڑکی کی خوبصورتی ایک جیتی جاگتی خوبصورتی تھی۔ جب وہ ہنستی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے دھوپ اور اُجلی ہو گئی ہو اور جھیل کے بلوری پانی میں مسکراہٹیں جھلک رہی ہوں۔ اس کے برعکس سارہ کی مسکراہٹ اتنی بے جان تھی جیسے وہ مسکرا نہ رہی ہو کسی ڈینٹسٹ کو اپنے دانت دکھلا رہی ہو۔

لڑکیوں کے پاس تو چھٹی حس ہوتی ہے لیکن اگر نہ بھی ہوتی تو بھی فاریہ جان گئی ہوتی کہ میں اس کی مسکراہٹ پر مرمٹ گیا ہوں۔ وہ بہانے بن بہانے مسکرائے جا رہی تھی اور عروسہ بار بار انگڑائیاں لے رہی تھی اور پہلو بدل رہی تھی تاکہ

اس کے سڈول بدن کی ایک ایک گولائی میری آنکھوں کو بھا جائے، میں سوچ رہا تھا کہ عروسہ جیسی لڑکی کو اکیلے ملنا کتنا ناقابل فراموش تجربہ ہوگا۔ پھر مجھے سارہ پر ترس آنے لگا جو بیچاری نہیں جانتی کہ سہیلیوں میں وہ دو ناگنیں ساتھ لے آئی تھی۔

کشتی چلاتے ہوئے کافی دیر تک ان تینوں کی خوبصورتی کا موازنہ کرتا رہا۔ اگر خوبصورتی کا کوئی پلس سائیٹ ہوتا اور ہر ایک کو ووٹ ڈالنے کا حق ہوتا ہے تو سنہرے بالوں، بھوری آنکھوں اور گورے شفاف رنگ والی سارہ بھاری اکثریت سے اپنی دونوں سہیلیوں کو شکست دے دیتی۔ لیکن کوئی بین الاقوامی مقابلہ ہوتا جہاں پنڈلیاں، رانیں اور چھاتیاں ناپتے ہیں۔ تو خوبصورتی کی ملکہ کا تاج یقیناً عروسہ کے سر پہ زیب دیتا۔ فاریہ کسی مقابلہ میں کامیاب نہ ہوتی کیونکہ اس کی خوبصورتی ایسی تھی جس کی قدر و قیمت کوئی گھائل عاشق ہی جان سکتا تھا۔

دو گھنٹے پیدل مارچ اور ایک گھنٹہ بوٹنگ کرنے سے بھوک چمک اٹھی تھی۔ فاریہ نے جب چٹائیوں پر پلیٹیں لگا کر ٹوماٹو ساس کی بوتل رکھی تو وہ مجھے بے حد پیاری لگی تھی۔ عروسہ نے اسٹوو جلا کر اوپر ساس پین رکھ دیا۔ سارہ نے ٹوکری میں سے کھانے پینے کے سامان کے ڈبے نکالنے شروع کیے۔ چکن فرنچ فش، مکھن، سوپ اور بھی بہت سارے ڈبے تھے۔

منہ میں بھرے آئے پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے فاریہ اور عروسہ کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے کہا۔

بند ڈبوں والے لنچ کا آئیڈیا سارہ کا اپنا ہے، بھئی واہ یہ تو ایک طرح کا بین الاقوامی لنچ ہو گیا۔ یہ ساری شاپنگ سارہ نے خود کی تھی۔

کسی نوکر چاکر پر بھروسہ نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ میری محبوبہ کوئی پھینک دینے والی چیز نہیں ہے۔

عروسہ بولی اور پھینکنے کو کون کہتا ہے آپ سے!

عروسہ کی بات ان سنی کرتے ہوئے میں نے کہا۔ بھئی بند ڈبوں کا لنچ بھی کیا چیز ہے۔ یعنی ڈبہ کاٹا۔ ساس پین میں الٹا اور لنچ تیار ہوگیا۔ یہ نہیں کہ آلو کاٹے جا رہے ہیں۔ پیاز چھیلے جا رہے ہیں میدہ گوندھا جا رہا کڑاہی میں تیل ڈالا جا رہا ہے لہسن پیاز کی بو سے تے آ رہی ہے، اور جب کہیں دوپہر ڈھلے پوریاں، آلو کا سالن اور پودینے کی چٹنی تیار ہوتی ہے تو کھانے والوں کی بھوک مر چکی ہوتی ہے۔

عروسہ بولی! آپ پاکستان کے مرد سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی عورتیں بس میمیں بن گئی ہیں لیکن آج آپ دیکھیں گے کہ ہم تعلیم یافتہ خواتین بھی باورچی خانہ کی قدیم روایات نہیں بھولیں۔ آج آپ کو وہ لنچ کھلانا ہے کہ آپ نے انگلیاں نہ کاٹ کھائیں تو میرا نام عروسہ نہیں۔ اور انگڑائی لے کر عروسہ نے میری طرف اس طرح دیکھا کہ میرا جی چاہا کہ سر سے لے کر پاؤں تک اسے اپنی آنکھوں سے نگل جاؤں۔

ایک دلکش ادا سے وہ بولی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کیا دیکھتے ہو؟

ذرا جھینپ کر میں نے کہا۔ کچھ نہیں بس میں سوچ رہا تھا کہ لنچ کو کیا ترتیب دی جائے، میرے خیال میں سب سے پہلے سوپ پھر فرائیڈ فش، پھر روسٹ چکن پھر۔

میری بات کاٹتے ہوئے عروسہ بولی۔ بھئی میں تو فرائیڈ فش پہلے لوں گی۔ اور ایک بار پھر کن انکھیوں سے اس نے مجھے یوں دیکھا کہ میں نے اپنے دل میں کہا۔

میری جان تجھے تو میں اپنی ران کی فش فرائی کر کے کھلا دوں۔

اچانک سارہ بولی۔ وہ ٹن کٹر کہاں گیا؟

ٹن کٹر؟ میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ بولی۔ وہ ٹن کٹر نہیں ہوتا جس سے بند ڈبے کاٹے جاتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ہوتا تو ہے۔

وہ بولی۔ وہ کہاں گیا؟

میں نے کہا۔ یہ تو بتانا مشکل ہے کہ ٹن کٹر کہاں جاتے ہیں اور کیا کرنے جاتے ہیں۔

سارہ کہتی گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے ٹوکری میں ڈالا تھا۔ میرا خیال ہے میں نے ڈالا تھا۔

میرا دل میرے معدے کی اندھی غار میں غرق ہو گیا۔ دنیا میری آنکھوں کے سامنے اندھیری ہونے لگی اور وہ بند ڈبے بے راستہ چکروں میں گھومنے لگے۔

عروسہ بولی۔ ہائے میں مرگئی ٹن کٹر کے بغیر یہ ڈبے کیسے کھلیں گے؟

بکواس بند کرو میں نے کہا اور پھر سارا کی طرف منہ پھیرتے ہوئے میں کہتا گیا۔ اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ بند ڈبوں کے لنچ کا تھرڈ کلاس آئیڈیا کس عقل کے دشمن نے تیرے دماغ میں بھرا تھا۔ کیا کوئی آلو پوریوں کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا، کیا ایک آدھ نوکر ساتھ نہیں لایا جا سکتا تھا۔ سارا دن بیس بیس نوکر بیکار گھر میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔

سارہ بولی۔ خود تو آپ نے کہا تھا کہ نوکروں کے سامنے پکنک میں وہ کیا کہتے ہیں بے

تکلفی نہیں رہتی۔

ہاں! میں نے کہا تھوپ دے سارا قصور میرے سر! یہ بھی میں نے کہا تھا کہ اس سالے ٹن کٹر کی کیا ضرورت ہے۔ اپنا ماتھا مار کر ڈبے توڑ لیں گے۔

فاریہ نے بیچ بچاؤ کرتے ہوئے فلسفیوں کی سی لاپروائی سے کہا، چلو لنچ نہ سہی، چائے ہی سہی اور وہ مسکرا کے تھرمس میں سے چائے پیالیوں میں بھرنے لگی، جو پیالہ فاریہ نے میرے سامنے رکھا وہ میں نے گھما کر دور پھینک دیا اور چیخ کر کہا۔ مجھے نہیں چاہیے چائے بھوک سے میری جان نکل رہی ہے۔ خالی پیٹ پی ہوئی چائے میری کلیجے کو لگے گی۔

عروسہ بولی۔ خالی پیٹ کیوں پیتے ہیں ساتھ میں ٹوماٹو ساس کھائیے۔

میں نے کہا۔ بکواس بند کر اور پھر اٹھ کر چائے کے تھرمس کو ٹھوکر مارتے ہوئے میں نے کہا۔ اٹھاؤ یہ سارا کباڑ باز آئے ایسی محبت سے۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ واپسی پر بھی یہ سارا سامان اٹھائے حکم کا غلام بنا تمہارے پیچھے پیچھے چلتا جاؤں گا تو یہ تمہارا وہم ہے یہ سب کچھ تم خود اٹھاؤ نہیں تو میں ابھی یہ سارا کباڑ خانہ جھیل میں پھینکتا ہوں۔

سارہ بولی۔ ہاں، ہاں پھینک دو جھیل میں، ان چیزوں پر میرے باپ کے گھاڑھے پسینہ کی کمائی جو خرچ ہوئی ہے، کونسے تمہارے ڈیڈی کے پیسے لگے ہیں۔

بہت لال پیلا ہو کر میں نے کہا۔ تو یہ کہنا چاہتی ہے کہ میرے ڈیڈی کی کمائی گھاڑھے پسینہ کی نہیں۔

وہ بولی۔ زمیندار کو جو پسینہ آتا ہے وہ کتنا گاڑھا ہوتا ہے۔

یہ میں دعوے کیساتھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا جواب دینا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ بس یہی جواب دیا کہ وہ ڈبے، وہ اسٹوو، وہ ساس پین، وہ چٹائیاں، وہ پیالیاں سب اٹھا کر جھیل میں پھینک دیں۔ واپسی کا پیدل دو کلومیٹر راستہ غصے غصے میں کٹ گیا۔ عروسہ کسی ہوئی گلابی جینز ہپس لٹکاتی رہی اور میں نے سوچا یہ لڑکی کتنی موٹی اور بھدی ہے اسے ضرور ڈائیٹنگ کرنی چاہیے فاریہ بات بے بات مسکراتی رہی مانا کہ اس کی یہ مسکراہٹ اتنی بری نہیں تھی لیکن یہ لڑکی حماقت کی حد تک اس مسکراہٹ میں پیاری لگ رہی تھی۔ سارہ کی طرف میں نے بالکل توجہ نہ دی۔ بڑی اپنے آپ کو میری محبوبہ سمجھتی تھی۔

بھوک کا طوفان میرے اندر اٹھ رہا تھا۔

تاہم کار میں ایکسی لیٹر پر پاؤں رکھنے کے بعد جب کلومیٹر اڑنے لگے تو میں نے ایک کڑی کوشش سے اپنا موڈ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ آؤ ہم سب کیفے سنگیت چلیں آج میں تمہیں ایک یادگار لنچ کھلاؤں گا۔ سارہ نے پھولے ہوئے منہ سے کہا۔ ہمیں بھوک نہیں۔ آپ برائے مہربانی ہم تینوں کو میری کوٹھی پر اتار دیجیے۔

میرے دل نے کہا۔ یہ لڑکی منہ پھیلا کے بالکل بھیڑ جیسی لگتی ہے۔ آخر میں نے اس میں کیا دیکھا کہ اسے کار میں بٹھا کر ڈرائیو کر رہا ہوں۔

ان تینوں کو سارہ کی کوٹھی پر ٹپک کر اور سارہ سے طنز آمیز تھینکس وصول کر کے میں کیفے سنگیت پہنچا۔ بیرے نے مینو سامنے لا رکھا تو میں نے بغیر کچھ کہے سنے کے حاشیے میں ایک لمبی لکیر کھینچ دی جب میز پلیٹوں سے بھر گیا اور بیرے نے منہ پھیرا تو میں نے یہ نہیں سوچا کہ پہلے کون سی پلیٹ صاف کروں۔ بلکہ بیک وقت سبھی پلیٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ جیسے بھوکا باز مرغابیوں، ابابیلوں پر ٹوٹ پڑتا ہے، پھر میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے چھلے کیف سنگیت ایئر کنڈیشنڈ ڈائننگ ہال میں پھینکتے ہوئے میں نے سوچا کہ سارہ کے ساتھ بگاڑنے میں کوئی عقلمندی نہیں کیونکہ سوال سارہ کا نہیں فاریہ اور عروسہ کا بھی ہے۔ اس تصور نے میرا رواں رواں جھنجھنا دیا اور میں نے کہا کہ میں ابھی جا کر سارہ کو منا لوں گا۔ لڑکیوں کو منانے کا کیا ہے دو میٹھے بول، سوری ڈارلنگ، ذرا سا دبا دیا اور لڑکی یوں ہی پگھل جاتی ہے۔

کار کی چابی اپنی انگلی کے گرد گھماتا ہوا ایک مستی سی میں ہوٹل سے باہر نکلا تو میں سوچ رہا تھا کہ عشق کرنے کیلئے لنچ کتنا ضروری ہے کیفے سنگیت کے باہر مجھے ایک بھکاری مل گیا۔ میں نے سوچا ایسے شخص کو روٹی کی کیا ضرورت ہے اس نے کونسا عشق کرنا ہے۔ عشق آدمی کرتے ہیں ہڈیوں کے پنجر نہیں کر سکتے۔ ان بخار جلی آنکھوں اور پڑی جمے ہونٹوں سے عشق کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا اور اگر عشق کرنے کا سوال نہیں اٹھتا تو روٹی کا سوال بالکل نہیں اٹھتا اور میرا دل ایسے سب لوگوں کے لئے حسد سے بھر گیا جنہیں نہ عشق کی مجبوری تھی اور نہ روٹی کی لاچاری تھی۔ پھر اس بھکاری کا خیال مجھے بالکل بھول گیا اور میرے شعور کے اسٹیج پر گولائیاں، مسکراہٹیں اور سنہری بالوں کے لچھے ابھر آئے۔ عروسہ، فاریہ، سارہ اور میں سوچ نہ سکا کہ پہلے کس کو کھاؤں۔ ایک ہی بار تینوں پر ٹوٹ پڑنا چاہتا تھا جیسے بھوکا باز ابابیلوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

افسانہ

آسمان، دائرہ اور میں

نسیم سکینہ صدف

مجھے اپنا آسمان ہمیشہ سے بہت پسند تھا۔ اس کا رنگ اس کی تنہائی اس کی وسعت، سب کچھ۔ آسمان میرا آسمان۔ مجھے لگتا یہ آسمان صرف میرا ہے اور میرا ہی تھا۔ شاید اس لئے کہ میں ایسا سمجھتی تھی۔ ہوسکتا ہے۔ میرے سوا کوئی اور بھی۔ آسمان کو صرف اپنا سمجھتا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ سب لوگ آسمان کو اپنا ہی سمجھتے ہوں۔ لیکن مجھے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی۔ میں تو صرف اتنا جان کر ہی خوش تھی۔ کہ یہ نیلا، خوش نما اور وسیع آسمان میرا ہے۔ صرف میرے لئے ہے۔ جب میں بہت چھوٹی تھی اس وقت بھی مجھے آسمان سے بے حد لگاؤ تھا۔ میری دادی بتاتی تھیں کہ بچپن میں جب میں بے وجہ روتی مجھے کھلے آسمان کے نیچے لٹا دیا جاتا۔ اور میں بالکل خاموش ہو جاتی۔ اور آسمان کی طرف دیکھ کر ہاتھ پاؤں چلاتی اور غوں غوں کیا کرتی۔ جب میں اور بڑی ہوئی تو میرے برابر کی دوسری لڑکیاں۔ گڑیوں سے کھیلنے لگیں لیکن میں ان کے کھیل میں شریک ہونے کی بجائے چھت پر چلی جاتی اور گھنٹوں آسمان کو تکا کرتی۔

آسمان ہی میرا پسندیدہ کھلونا تھا۔ کبھی میں نیچے آنگن میں کھڑی ہو کر آسمان کو دیکھتی تو وہ ہشت پہل نظر آتا، کبھی کمرے کی کھڑکی سے دیکھتی تو وہ چوکور ہو جاتا۔ میں دوڑ کر چھت پر جاتی اور آسمان بھی پھیل کر بڑا ہو جاتا۔ کبھی میں آنکھیں سمیٹ کر آسمان کو دیکھتی۔ وہ نہ جانے کتنے دھندلے ہولے میری آنکھ اور آسمان کے بیچ تیرنے لگتے۔ اور کبھی جب میں آنکھیں مل کر آسمان پر نگاہ ڈالتی تو سرخ، نارنجی، نیلے اودھے، ڈھیروں دائرے چھوٹے بڑے ہوتے ہوئے میری آنکھوں میں پھیل جاتے۔ کبھی کبھی کوئی جہاز یا راکٹ بہت تیزی سے آسمان کو چیرتا ہولا گزرتا تو میں ڈر جاتی۔ کہیں میرے آسمان کو کوئی کھروچ نہ آجائے۔ ہوائی جہاز کے پیچھے دھوئیں کی سفیدی لکیریں بن جاتیں۔ مجھے لگتا جیسے میرا آسمان گھائل ہو گیا ہے۔ میں بے چین ہو جاتی۔ اور اضطرب آمیز نظروں سے دھوئیں کی لکیر کو تب تک دیکھتی رہتی۔ جب تک کہ وہ بادل کی طرح پھیل کر بالآخر اوجھل نہ ہو جاتی۔ اور تب کہیں جا کر میرے دل کو چین آتا۔ آسمان کے ساتھ یوں ہی کھیلتے کھیلتے ایک دن میں بڑی ہوگئی۔ اور جب میں بڑی ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ آسمان میرے اندازے سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ یا پھر میں اسی دن بڑی ہوئی جس دن مجھے آسمان کی وسعت کا اندازہ ہوا یا شاید پہلے بڑی ہوئی اور پھر مجھے آسمان کی پنہائی کا اندازہ ہوا۔ لیکن میرے بڑے ہونے اور آسمان کی وسعت کے انکشاف میں کوئی قریبی رشتہ ضرور تھا۔ میں بڑی ہوتی جا رہی تھی اور آسمان وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ یا پھر آسمان وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ اور میں بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے جیسے مجھے آسمان کی وسعت پر یقین آتا گیا۔ آسمان کے لئے میری دیوانگی بڑھتی گئی تھی۔ مجھے لگتا کہ میں تو آسمان میں ہی رہنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ اور غلطی سے شاید آسمان ہی کی غلطی سے کبھی زمین پر گر گئی اور اب معلوم نہیں کتنی مدت تک مجھے یہاں رہنا ہوگا۔ اپنے سامنے پھیلی ہوئی بظاہر لامتناہی زندگی کا احساس کر کے میں رنجیدہ ہو جاتی۔ ایک دن جب میں چھت پر بیٹھی ہمیشہ کی طرح آسمان کو تک رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ آسمان پر ایک دائرہ سا بن گیا ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر دوبارہ دیکھا۔ دائرہ ہی تھا۔ ایک دائرہ جس کا رنگ آسمان کی نیلاہٹ سے کچھ ہی زیادہ گہرا تھا۔ پہلے تو میں کچھ پریشان ہوئی۔ پھر مجھے لگا یہ دائرہ آسمان کی خوش نمائی میں اضافہ کر رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اندھیرا چھانے لگا اور آسمان سیاہ ہو گیا۔ میں نے دیکھا دائرہ اب بھی وہیں موجود ہے۔ میں نے پھر غور سے دیکھا واقعی دائرہ اب بھی وہیں موجود تھا۔ اور اندھیرے میں اُس کا رنگ آسمان کی سیاہی سے کچھ ہی کم سیاہ معلوم ہوتا تھا۔

رات ہو چکی تھی۔ کسی نے مجھے نیچے سے آواز دی تو میں چھت سے نیچے اتر آئی۔ رات بھر میں ایک عجیب سی خوشگوار، بے چینی کا شکار رہی۔ لیکن صبح ہوتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔

جب میں جاگی تو دن چڑھ چکا تھا میں اٹھی اور اپنے چھوٹے موٹے کام نپٹا کر چھت پر آ گئی۔ میں نے آسمان کو بغور دیکھا کل والا دائرہ آج بھی موجود تھا مجھے برا نہیں لگا آج بھی اس کا رنگ آسمان کی نیلاہٹ سے کچھ زیادہ گہرا تھا۔ تیسرے دن، چوتھے دن، پانچویں دن.................. اب دائرہ آسمان کا حصہ بن چکا تھا۔ اور میں بھی اس کی عادی ہو چکی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہوتا آسمان کا تمام حسن اس خوبصورت دائرے کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ دائرہ نہ ہوتا تو آسمان کتنا خالی خالی لگتا۔ دائرے کے موجود ہونے سے پہلے آسمان کیسا لگتا تھا۔ اس کا تو میں اب میں تصور ہی نہ کر سکتی تھی۔

ہر روز وہ دائرہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آتا۔ اور آسمان کے لئے میری دیوانگی اور بڑھ جاتی۔ دائرہ بھی دھیرے دھیرے غیر محسوس طریقے سے پھیل رہا تھا۔ اس کا رنگ بھی گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ دن میں جب آسمان ہلکا نیلا ہوتا تو دائرہ گہرا نیلا نظر آتا۔ اور رات میں جب آسمان سیاہ ہو جاتا تو دائرہ روپہلی مائل ہو جاتا۔

ایک مرتبہ زوروں کا بخار آیا اور میں کئی دن تک بستر پر ہی پڑی رہی۔ ان دنوں ہر وقت مجھ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری رہتی۔ بیچ بیچ میں جب بھی مجھے ہوش آتا میں پریشان ہو کے رونے لگتی۔

گھر والے بھی پریشان تھے۔ تھوڑے دن ادھر ادھر دوڑانے کے بعد شہر کے بڑے حکیم کا علاج شروع کیا گیا۔ ان کے علاج سے مجھے کچھ افاقہ ہوا اور میری طبیعت دھیرے دھیرے سنبھلنے لگی۔ اس رات میری طبیعت قدرے بہتر تھی۔ گھر کے سارے لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی تو میں آنگن میں رکھی صراحی سے پانی لینے کے لئے کمرے سے باہر آ گئی۔ میں نے صراحی سے پانی انڈیل کر پیا اور تھوڑی دیر یونہی بے چین کھڑی رہی کتنے ہی دن ہو گئے آسمان دیکھے ہوئے۔ میں نے اچانک سوچا.......... پھر میں نے اوپر کی طرف نظر اٹھائی۔ آسمان بہت تاریک تھا۔ میں آہستہ آہستہ زینے چڑھتی ہوئی چھت پر آ گئی۔ دائرہ ہمیشہ سے زیادہ روشن اور چمکدار دکھائی دے رہا تھا۔ اتنا روشن کہ میں کچھ ہی دیر تک اسے بغور دیکھ سکی۔ موسم قدرے خشک تھا۔ میں واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ اور جلد ہی گہری نیند سو گئی۔ دوسرے دن میں بہت دیر سے جاگی۔ بستر سے اٹھ کے بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی میں اپنے کمرے سے نکل کر آنگن میں آ گئی۔ میں نے انگڑائی لی۔ اور اوپر کی طرف دیکھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

یہ کیا؟

آسمان تو وہاں تھا ہی نہیں۔ میں چھت کی طرف بھاگی۔ اوپر آ کر میں نے دیکھا دور وہ روشن دائرہ موجود تھا۔ لیکن اب وہ اودے رنگ کا ہو چکا تھا اور آسمان میرا پیارا آسمان اسی دائرے میں قید تھا۔ دائرے کے باہر صرف خلا تھا۔

ضروری گزارشات

ارژنگ میں اشاعت کے لیے اپنی تخلیقات ارسال کرنے والے معزز ادیبوں سے التماس ہے کہ درج ذیل گزارشات کو مدنظر رکھیں۔

① اپنی تخلیقات کاغذ کے ایک طرف خوش خط اور واضح تحریر فرمائیں۔

② لفافے پر ڈاک ٹکٹ مکمل لگائیں ورنہ ڈاک موصول نہیں کی جائے گی۔

③ اپنا مکمل تعارف پیراگراف کی صورت میں لکھیں یا اپنے حوالے سے کسی کا مضمون شاعری کے ساتھ ارسال کریں۔ نمونہ کے طور پر ارژنگ میں شائع شدہ شعری گوشے ملاحظہ فرمائیں۔

④ تاخیر سے موصوف ہونے والی ڈاک اگلے شمارے میں شامل اشاعت ہوگی۔ اُمید ہے آپ ارژنگ کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے اپنا قلمی تعاون جاری رکھیں گے۔ شکریہ

(عامر بن علی/حسن عباسی)

خالد شریف/ لاہور

ہر کوئی رو کے دکھا دے یہ ضروری تو نہیں ۔۔۔ خشک آنکھوں میں بھی سیلاب ہوا کرتے ہیں

خالد شریف ہمارے عہد کے نامور شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری نوجوان نسل میں بے حد مقبول ہے۔ وہ آسان اور سادہ زبان میں اپنی شاعری کا جادو جگاتے ہیں۔ وہ اپنی غزل کو روایت اور جدت میں گوندھ کر منفرد اور دل پذیر بناتے ہیں۔ خالد شریف کی شاعری گداز دلوں کو اور گداز بناتی ہے۔ وہ محبت کرنے والے شخص ہیں اور یہی محبت اُن کی شاعری کی اساس ہے۔ اُن کی شخصیت اور شاعری میں انفرادیت ہے اور یہی انفرادیت انہیں باقی شعراء سے ممتاز بناتی ہے۔ ان کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "نارسائی"، "بچھڑنے سے ذرا پہلے"، "وفا کیا ہے"، "گزشتہ" اور "رُت ہی بدل گئی" شامل ہیں۔ (شازیہ نورین)

رُخصت ہوا تو بات مری مان کر گیا
جو اُس کے پاس تھا وہ مجھے دان کر گیا
بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا
دلچسپ واقعہ ہے کہ کل اِک عزیز دوست
اپنے مفاد پر مجھے قربان کر گیا
کتنی سدھر گئی ہے جدائی میں زندگی
ہاں وہ جفا سے مجھ پہ تو احسان کر گیا
خالدؔ میں بات بات پہ کہتا تھا جس کو جان
وہ شخص آخرش مجھے بے جان کر گیا

نہیں جانِ جہاں ایسا نہیں ہے
یہ بندھن ٹوٹنے والا نہیں ہے
نہ اُترے گا تمہارے پیار کا رنگ
یہ دھیما ہے مگر کچا نہیں ہے
میں اپنی روح دے کر جسم لے لوں
یہ سودا اس قدر سستا نہیں ہے
کھلی ہیں کھڑکیاں لیکن مکاں گم
اُن آنکھوں کے تلے چہرہ نہیں ہے
جب اپنے اپنے مقصد یاد آئے
کھلا، ہم میں کوئی رشتہ نہیں ہے

ابھی اِک لمحہ پہلے سوچتے تھے
کہ دُنیا میں کوئی ہم سا نہیں ہے
اور اب یہ بھی نہیں ہے یاد ہم کو
وجود اپنا کہیں ہے یا نہیں ہے
جدا ہونے کا اس موسم میں خالدؔ
اُسے بھی دکھ ہے پر اتنا نہیں ہے

عشق کرنے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں
جاگتی آنکھوں کے کچھ خواب ہوا کرتے ہیں
ہر کوئی رو کے دکھا دے یہ ضروری تو نہیں
خشک آنکھوں میں بھی سیلاب ہوا کرتے ہیں
کچھ فسانے ہیں جو چہرے پہ لکھے رہتے ہیں
کچھ پسِ دیدۂ خونناب ہوا کرتے ہیں
کچھ تو جینے کی تمنا میں مرے جاتے ہیں
اور کچھ مرنے کو بے تاب ہوا کرتے ہیں
تیرنے والوں پہ موقوف نہیں ہے خالدؔ
ڈوبنے والے بھی پایاب ہوا کرتے ہیں

اپنے ماحول سے بچھڑی ہوئی تم لگتی ہو
پاس بیٹھی ہو پہ اُلجھی ہوئی تم لگتی ہو
تم سے اپنے ہے کوئی پچھلے جنم کا رشتہ
جاگتے سوتے میں دیکھی ہوئی تم لگتی ہو
یہ لب و لہجہ یہ آنکھیں نہیں اس دُنیا کی
مجھ کو مریخ سے آئی ہوئی تم لگتی ہو
چاندنی رات میں پھیلی ہوئی خوشبو کی طرح
مجھ کو ہر سمت سے آتی ہوئی تم لگتی ہو
ایک بے نام اُداسی کی جھلک چہرے پر
شاید اس شہر سے رُوٹھی ہوئی تم لگتی ہو

جو ہر مقام پر تجھے وحشت میں چھوڑ دے
اک دن تو اُس کو غم کی مسافت میں چھوڑ دے
خوش آ گئی ہے لذتِ سنگِ سخن مجھے
اے دوست مجھ کو کوئے ملامت میں چھوڑ دے
میں ایسا جنگ جو ہوں جو میدانِ جنگ میں
دشمن کو زیر کر کے مروّت میں چھوڑ دے
اُس کا مزاج ہے یہ اُسی کا مزاج ہے
نفرت میں ساتھ رکھ لے، محبت میں چھوڑ دے
اس کھوکھلے سماج سے ہونے دے آشنا
کچھ روز اُس کو کوچۂ شہرت میں چھوڑ دے
خالدؔ وہ سامنے ہے مگر چاہتا ہے دل
تنہا مجھے وہ کنجِ رفاقت میں چھوڑ دے

آفتاب راجا/ساہیوال

خاموش راستوں کی پذیرائیوں میں گم　　اکثر ترے خیال نے چونکا دیا مجھے

آفتاب راجا عمر عزیز کی ستر بہاریں دیکھ چکے ہیں لیکن ان کی شاعری نے ابھی تک صرف آٹھ بہاریں دیکھی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ "زندگی کی بچپن بہاریں دیکھ چکا تو ایک دن ڈاکٹر نے دوا دینے کے ساتھ برسبیل تذکرہ وضاحت چاہی کہ تمہیں کیا دکھ ہے جو تمہیں اندر ہی اندر جلا رہا ہے۔ ۱۳۰/۲۱۰ تو بہت بلند فشار خون ہے۔ اپنا خیال کرو، لکھا کرو، نظم یا نثر کچھ بھی لکھو لیکن جو کچھ تمہارے اندر ہے اسے باہر نکالو" نتیجتاً ڈاکٹر کے تجویز کردہ نسخے کے مطابق آفتاب حسین نے شاعری شروع کر دی۔ آفتاب راجا کا تخلیقی سرمایہ کم سہی لیکن اپنے والد مرحوم جوہر نظامی کی ادبی سرگرمیوں میں طویل عرصہ تک شمولیت کے باعث غیر رسمی طور پر ان کی جو تربیت ہوئی ان کی شخصیت اور شاعری پر اس کا اثر بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ انہوں نے جتنا بھی لکھا ہے اس میں توانائی اور تازگی موجود ہے۔

چند آنسو میری پلکوں کو سجانے نکلے
یاد کے زخم ترا سوگ منانے نکلے
جو نہ نکلے کبھی شب کو وہی خورشید جہاں
دن کو مہتاب ستاروں کو چھپانے نکلے
جن کو ہم اپنا سمجھتے تھے وہ بیگانے ہوئے
جو مقابل تھے وہی دوست پرانے نکلے
ایک انگشت شہادت کا نگینہ بنے تم
اور چاہت کے جو قصے تھے فسانے نکلے
"جادۂ عشق سے ہم رہ گزر شوق سے ہم"
ایسے گزرے کہ تعاقب کو زمانے نکلے
لوگ مر جائیں یہ مرضی ستم ایجاد کی ہے
کاسۂ جاں لیے سڑکوں پہ سیانے نکلے
کوئی نیزے کی انی پر نہ سنائے گا کبھی
لوگ ہر دور میں قرآن سنانے نکلے

کبھی مجھ کو دشت سے پیار تھا مگر اب نہیں
میں جنوں کی فصل بہار تھا مگر اب نہیں
مرے من میں تھی کبھی اضطراب کی کیفیت
مرے دل میں ایک غبار تھا مگر اب نہیں
کبھی میں جو مشت غبار تھا یہ شعار تھا
مجھے گرد راہ سے پیار تھا مگر اب نہیں
ترے قرب میں جو گزر گیا سو گزر گیا
وہی لمحہ مثل بہار تھا مگر اب نہیں
کبھی رات دن مرا ذکر اُس کے لبوں پہ تھا
اُسے مجھ سے ہی سروکار تھا مگر اب نہیں
سر راہ ایک ہی بار اُس سے ملا تھا میں
وہی عشق تھا وہی پیار تھا مگر اب نہیں
کبھی آفتاب ملا تھا ہم کو زمین پر
کبھی دوستوں میں شمار تھا مگر اب نہیں

ظلم کی اپنی کائنات الگ
جیسے ہوتی ہے دن سے رات الگ
تم سے ملنے کی آرزو وہی رہی
نہ ہوئی تم سے کوئی بات الگ
ہجر میں انتظار کے لمحات
وصل میں حُسنِ التفات الگ
حُسن کی راہِ التفات جدا
عشق کی منزلِ حیات الگ
میں مقید ہوں گھر کے آنگن میں
یوں گزرتی ہے میری رات الگ
وہ کسی سے کہیں نہیں ملتا
اُس کی ہے اپنی کائنات الگ
ہیں وسائل مرے بہت محدود
میں جو کرتا ہوں واردات الگ

جینے کا شوق موت کا کھٹکا دیا مجھے
تو نے جہان درد میں کیا کیا دیا مجھے
جب کوئی آرزو مرے دل میں مچل گئی
اُمید کی کرن نے دلاسا دیا مجھے
مجھ کو حصولِ رزق پہ مامور کر دیا
کچھ دے دیا کبھی کبھی بہلا دیا مجھے
دیوانہ وار ٹوٹ کے برسا سحاب غم
آنکھوں نے آنسوؤں کا وہ دھارا دیا مجھے
خاموش راستوں کی پذیرائیوں میں گم
اکثر ترے خیال نے چونکا دیا مجھے
یادوں سے میرے ذہن کو آباد کر دیا
جب مجھ سے بھول ہو گئی سمجھا دیا مجھے
میں تو غبار راہ کے قابل نہ تھا مگر
تو نے فراز عرش پہ پہنچا دیا مجھے
اے آفتاب کتنے تعجب کی بات ہے
نظریں ملا کے یار نے بہکا دیا مجھے

قیوم طاہر/راولپنڈی

زندگی تجھ سے بہت سادہ سوالات کیے　　زندگی تو نے وہ لوٹائے ہیں مشکل کر کے

قیوم طاہر کی شاعری کے موضوعات انوکھے بھی ہیں اور اچھوتے بھی۔ وہ مشکل اور پامال زمینوں میں بھی نہایت آسانی سے بھرپور غزل کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بہت کم شاعر ایسے ہوتے ہیں ایک طرف جن کی شاعری میں بے ساختہ پن ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ فنِ عروض پر بھی مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ قیوم طاہر ان معدودے چند شعراء میں سے ہیں۔ انھوں نے بطور مدیر بھی اپنی صلاحیتوں کو منوایا ہے۔ ان کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے ادبی پرچے "آفاق" کے جتنے شمارے منظرِ عام پر آئے وہ اپنی جمالیاتی حسن تخلیقات اور طباعت کے لحاظ سے نہایت عمدہ تھے۔ قیوم طاہر کی شاعری کی مقبولیت ملکی سرحدوں سے باہر بھی پہنچ چکی ہے۔ وہ بیرونِ ملک بھی متعدد عالمی مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ (ارژنگ)

عشق اور عشق کے آداب کا کیا کرنا ہے
تو نہیں ہے تو کسی خواب کا کیا کرنا
جب ترا نام مرے نام کے ساتھ آیا نہیں
حرف کا، لفظ کا، اعراب کا کیا کرنا ہے
اک ہی چادرِ ہجراں مجھے دے کر اُس نے
کہہ کے رُخصت کیا اسباب کا کیا کرنا ہے
کترنیں رنج کی، سانسوں میں گرہ ڈالتی ہیں
عمر کے ریشم و کم خواب کا کیا کرنا ہے
اب سمندر ہے، نہ پر ہیں، نہ شبِ چار دہم
اب تری آنکھ کے مہتاب کا کیا کرنا
آسماں چشم برابر بھی نہ تارہ کوئی
اب بتا روزنِ خوش تاب کا کیا کرنا

خوابوں کی تعبیریں اور آنکھوں کا نم بھی رکھ دیتا تھا
ایک پرانی الماری میں، اُس کا غم بھی رکھ دیتا تھا
سپنوں، پھولوں اور خوشبو سے، جگہ بچے تو اک کونے میں
دھندلی ہوتی تصویروں کا اک البم بھی رکھ دیتا تھا
لہرا جاتی دیواروں پر، بیل کوئی اُن بالوں جیسی
آنگن کے ویرانے میں، آہو کا رَم بھی رکھ دیتا تھا
اپنی جھولی اور ہتھیلی اور یہ کاسہ بھی اتنا سا
وہ بھی کچھ زائد ہو جاتا، جتنا کم بھی رکھ دیتا تھا
صحرا صحرا ہجر کا رستہ، گلتی عمروں کا سناٹا
دریا جیسا دید کا منظر، کوئی خم بھی رکھ دیتا تھا
مٹی کا رشتہ گہرا تھا، ورنہ طاہر صاحب ہم نے
آنکھیں عرش پہ اور سورج پر ایک قدم بھی رکھ دیتا تھا

اپنی کرنوں میں مری آنکھ بھی شامل کر کے
اک ستارہ تجھے تکتا رہا جھلمل کر کے
زندگی! تجھ سے بہت سادہ سوالات کیے
زندگی! تو نے وہ لوٹائے ہیں مشکل کر کے
ایسی پھر نیند کہ تعبیر کا ڈر بھی نہ رہا
بازو اک خواب کی گردن میں حمائل کر کے
پھر بدل ڈالیں یہ ترتیب میں رکھی سانسیں
مطمئن خود نہ ہوا، خود کو میں قائل کر کے
دیر تک چھاؤں کی کرتا رہا باتیں طاہر
میری دھوپوں میں نئی دھوپ کو شامل کر کے

اپنی مرضی کے وہ پانی میں نہیں رہتا ہے
دیر تک کوئی روانی میں نہیں رہتا ہے
ایک کردار جو کرتا ہے فسانہ آغاز
پھر وہ کردار کہانی میں نہیں رہتا ہے
پہلی چاہت کہ کوئی کیسی ہو رنگوں والا
پھر تو دھاگا بھی نشانی میں نہیں رہتا ہے
وقت پھر وقت ہے لے آتا ہے اپنی رو پر
دل کسی یاد پرانی میں نہیں رہتا ہے
جتنی بولی بھی لگے، بیچ کے آئیں اس کو
زیست کا بھاؤ، گرانی میں نہیں رہتا ہے
یاد آتے ہیں پلٹنے کے بہانے قیوم
کچھ بھی جب نقل مکانی میں نہیں رہتا ہے

کوئی خواب تھا کہ گمان تھا وہ کہاں گیا
وہ جو آرزو کا جہان تھا، وہ کہاں گیا
یہاں دودھ رنگ مکین تھے، وہ کدھر گئے
جو دھنک سا ایک مکان تھا، وہ کہاں گیا
یونہی پوچھتا کبھی راہ کے کسی موڑ سے
وہ جو جگنوؤں کے سمان تھا، وہ کہاں گیا
کوئی نقش تھا کہیں کھو گیا جو غبار میں
کوئی اسم وردِ زبان تھا وہ کہاں تھا
نہیں رت جگا مرے ذکر کا، تری آنکھ میں
یہاں ہجر رُت کا نشان تھا، وہ کہاں گیا
سبھی فیصلوں پہ طلائی ڈھول کے رنگ ہیں
کہیں صاف و سادہ بیان تھا وہ کہاں گیا

یوسف مثالی / لاہور

ایک ایک کر کے سبھی چھوڑ گئے ہیں مجھ کو — اب تو سوچا ہے پرندہ بھی نہ پالا جائے

یوسف مثالی غزل کے نہایت اعلیٰ اور خوبصورت شاعر ہیں۔ اُن کی غزل کا خمیر اگرچہ روایت سے اُٹھتا ہے مگر وہ اس میں جدت کی آمیزش کر کے اسے قاری کے لیے نہایت دل پذیر اور جاندار بنا دیتے ہیں۔ یوسف مثالی کی غزل ہمارے عہد کی نمائندہ غزل ہے جس میں نہ صرف موضوعات کی کہکشاں بکھری ہوتی ہے بلکہ چمکتے دمکتے اشعار کے پیچھے برسوں کا علم، مطالعہ، ریاضت اور مشقِ سخن بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ یوسف مثالی نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی شاعری میں جو انجمن آرائی کی ہے وہ قابلِ دید ہے۔ وہ شعر کو شعر بنانے کے ہنر سے بخوبی آشنا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری ادبی اور عوامی حلقوں میں یکساں مقبول ہے۔ شاعری کی طرح اُن کی شخصیت بھی نہایت پُرکشش اور دل پذیر ہے۔ وہ نستعلیق انسان اور ادب دوست شخص ہیں۔

جدھر دیکھوں درختوں پر اُداسی کا بسیرا ہے
مرے اندر کی ویرانی یہ سارا کام تیرا ہے
کہاں سے ڈھونڈ کر لائے کوئی اُمید کی کرنیں
بجھی آنکھوں میں اب بجھتی ہوئی شاموں کا ڈیرا
تمہارے بعد سے کوئی یہاں رہنے نہیں آیا
کہا جاتا ہے اب اس گھر میں جنوں کا بسیرا ہے
کسی پودے کو اپنے سائے میں کیسے پنپنے دے
یہ برگد بھی تو آخر اپنی بستی کا وڈیرا ہے
یہاں کیسے حفاظت ہو سکے گی اپنی پونجی کی
یہاں کا مسئلہ یہ ہے محافظ ہی لٹیرا ہے
پلٹ کے دیکھتا ہوں تو دکھائی کیوں نہیں دیتا
مجھے کس نے پکارا ہے، یہاں پر کون میرا ہے
مرے ہر دن میں یوسفؔ رات کی پیوند کاری ہے
مری دنیا کی ہر اک شے کے سائے میں اندھیرا ہے

کیا ضروری ہے کوئی زخم کریدا جائے
میں جو خوش ہوں تو مرا حال نہ پوچھا جائے
میں کسی شخص کا اظہار نہ بن پاؤں گا
مجھ کو الفاظ کے سانچوں میں نہ ڈھالا جائے
صرف اس خوف سے اُٹھے نہ قدم تیری طرف
میرا سایہ کہیں مجھ سے ہی نہ نکلا جائے
شبِ فرقت میں بدل جائے نہ یہ شام کہیں
اس سے کہنا کہ وہ اب لوٹ کے گھر آ جائے
تو نے دیکھے نہیں یاروں کے بھیانک چہرے
ورنہ تو بھی مرے آشوب سے گھبرا جائے
ایک اِک کر کے سبھی چھوڑ گئے ہیں مجھ کو
اب تو سوچا ہے پرندہ بھی نہ پالا جائے

ہر بار اس نے ساتھ نبھانے کی بات کی
پھر اس کے ساتھ ساتھ زمانے کی بات کی
اُس کا مزاج موجِ ہوا سے بھی تیز تھا
میں نے ہی بھول کی جو ٹھکانے کی بات کی
مجھ کو اِدھر اُدھر سے اکٹھا کیا گیا
پھر آندھیوں سے خاک اُڑانے کی بات کی
خود ہی مری بساط سے باہر نکل گیا
کس وقت میں نے اُس کو نہ پانے کی بات کی
آنکھوں نے میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا
جب اُس نے مجھ کو خواب دکھانے کی بات کی
ہر راستے نے رکھ لیا خود کو لپیٹ کر
جس وقت میں نے لوٹ کے آنے کی بات کی
پہلے مرے خلاف مجھے کر دیا گیا
پھر مجھ سے میری بات اُٹھانے کی بات کی
آپس میں میرے سارے عناصر بھی لڑ پڑے
کس نے مجھے وجود میں لانے کی بات کی

پہلے تو بحرِ ذات کو زخار کر دیا
پھر پار کی طلب نے مجھے پار کر دیا
پوروں کے زخم زخم سے لے لو گواہیاں
جس کو بھی چھو لیا اُسے شہکار کر دیا
دنیا تو مجھ کو مان رہی تھی بصد نیاز
میں نے ہی اپنے آپ سے انکار کر دیا
رکھا گیا ہے صرف یہ رات کا بھرم
جگنو مجھے دیا ہے مگر مار کر دیا
جو شخص میری جان کا دشمن لگا مجھے
میں نے اُسی سے پیار کا اظہار کر دیا
جب میری جیت چوم رہی تھی مرے قدم
پیچھے سے دوستوں نے کڑا وار کر دیا
اُس راہ پر نجات کی حوریں تھیں منتظر
جس راستے کو یار نے تلوار کر دیا
اچھے دنوں کی آس کہاں تک سنبھالتا
اُس نے تو گھر کا خواب ہی مسمار کر دیا

فرحت زاہد/امریکہ

درازمیں چوڑیاں پڑی ہیں کلائی میں وہ کھنک رہا ہے

فرحت زاہد اگرچہ طویل عرصہ امریکہ میں مقیم رہی ہیں مگر ان کا نام پاکستان کے ادبی حلقوں میں خاص پہچان رکھتا ہے۔ اُن کا شعری مجموعہ ''لڑکیاں ادھوری ہیں'' شائع ہوا تو اُسے امریکہ اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں یکساں پذیرائی ملی۔ ان کا تعلق خواجہ غلام فرید کی دھرتی بہاول پور سے ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں صحرا کا سکوت بھی ہے اور دریا کی روانی بھی۔ مختلف تہذیبوں میں رہنے کے باوجود انھوں نے اپنے اندر کی مشرقی لڑکی کے جذبوں کو ہمیشہ تازہ اور جوان رکھا۔ ان کی شاعری نسائی جذبات کی بھرپور ترجمان ہے۔ وہ نظم اور غزل دونوں میں اپنے بے ساختہ پن کی وجہ سے کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔ اُن کی شاعری کے موضوعات نئے اور اچھوتے ہیں۔ مشاعرے میں وہ دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کے اس طرح اشعار سناتی ہیں کہ شعر سامعین کے دلوں کو چھو کر گزرتے ہیں۔ ہمارے عہد کی شاعرات میں ان کی آواز نہایت منفرد اور نمایاں ہے۔

یہ چاند مجھ کو ہی تک رہا ہے
ہمیں ہمیشہ یہ شک رہا ہے
یہ کون خوش فہمیوں کا موسم
ہمارے اندر مہک رہا ہے
دراز میں چوڑیاں پڑی ہیں
کلائی میں وہ کھنک رہا ہے
میں زیر لب مسکرا رہی ہوں
وہ مجھ میں اب تک چہک رہا ہے
یہ عشق پیچاں کے راستے ہیں
ہر اک مسافر بھٹک رہا ہے

میں کسی کے ساتھ ہوں اور وہ کسی کے ساتھ ہے
اک مسلسل حادثہ یہ زندگی کے ساتھ ہے
تج دیے پیمان اس نے رکھ لیا چھوا مرا
عمر بھر کا ساتھ ہے اجنبی کے ساتھ ہے
میں نے بھی بھولے سے اپنے خواب رکھے تھے وہاں
وہ جو پیلا سا مکاں اپنی گلی کے ساتھ ہے
دھوپ چھاؤں کی طرح ٹھہرے ہیں اس دہلیز پر
زندگی کرنا کہاں اپنی خوشی کے ساتھ ہے
جب ستارے جاگتے تھے آسماں پر وہ بھی تھا
چاند اب سنتے ہیں اپنی چاندنی کے ساتھ ہے

دہشت گردی پر ایک نظم

ہواؤں میں یہ کیسی بے یقینی ہے
ہمارے صحنِ گلشن میں
کسی آسیب کا سایا لرزتا ہے
مرا دل ڈر رہا ہے
کہ میرے لال، اپنی ہی زمیں پر
بے زمیں ہونے لگے ہیں
مرے پھولوں کی قیمت لگ رہی ہے
مری خوشبو کو بیچا جا رہا ہے
خدا کے نام لیوا
بے یقینی میں
یقیں کی سرحدوں کو پار کرتے ہیں
گھروندے پیار کے مسمار کرتے ہیں
مرے محراب و منبر سے
جنازے اُٹھ رہے ہیں
مرے مولا!
مری گلیوں کی وہ رونق
مرے چہروں کی شادابی
مرے موسم وہ سارے اودے، پیلے اور گلابی
پھر سے عطا کر دے

سفر میں بس دعا کا آسرا ہے
وگرنہ راستا سب دھوپ کا ہے
میں اپنی شام میں کھلی ہوئی ہوں
ستارا میری جانب دیکھتا ہے
کھلے ہوں جنگلوں میں پھول جیسے
تعلق دائرہ در دائرہ ہے
دیے کے ساتھ تو میں بھی جلی ہوں
تمہاری آنکھ میں کیوں رتجگا ہے
خوشی میں پناہیں ڈھونڈتے ہیں
محبت کا عجب یہ سلسلہ ہے

ملاح نہ کشتی کوئی ستلج کے کنارے
اک یاد پڑی ہے مری، ستلج کے کنارے
جو ریت اُٹھائی تھی، وہ مٹھی میں نہیں ہے
پاؤں سے زمیں کھو گئی، ستلج کے کنارے
کرتے رہے جمع، تیری باتیں تیری خوشبو
اک عمر کی سوغات تھی، ستلج کے کنارے
اس بار ارادہ تو کہیں اور تھا فرحت
پھر ناؤ مری آ گئی ستلج کے کنارے

زاہد سعید/امریکہ

اپنے ہونے کا حوالہ مجھے دینا ہوگا   میں دیا ہوں تو اُجالا مجھے دینا ہوگا

زاہد سعید زاہد طویل عرصے امریکہ میں قیام کے بعد آج کل لاہور میں مقیم ہیں۔ وہ گزشتہ تیس سال سے شعروادب سے وابستہ ہیں خود بھی باکمال شاعر ہیں اور امریکہ میں قیام کے دوران انھوں نے بطور میزبان نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے شعراء کی بھرپور پذیرائی کی بلکہ شعروادب کے فروغ کے لیے بھی اُن کی خدمات گراں قدر ہیں۔ زاہد سعید زاہد کی غزل زندگی کے مختلف موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ زندگی کا گہرا شعور اور ادراک رکھتے ہیں۔ فنِ شعر پر بھی مکمل دسترس ہے اس لیے مشکل اور پامال زمینوں میں بھی باکمال غزلیں کہتے ہیں۔ مشاعرے کے بھی نہایت کامیاب شاعر ہیں۔ تحت اللفظ سے کلام پڑھتے ہیں۔ انداز ایسا بے ساختہ کہ سامعین داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ زاہد سعید زاہد کی شخصیت بھی اُن کی شاعری کی طرح دلچسپ اور باکمال ہے۔

غیروں سے جو تعبیر کا سودا نہیں ہوتا
اک خواب بھی اپنا کبھی رُسوا نہیں ہوتا
دکھلاتا ہے اوروں ہی کا یہ رُوپ ہمیشہ
آئینہ کا اپنا، کوئی چہرا نہیں ہوتا
جس سمت سے چاہے گی چلی آئے گی گھر میں
مخصوص کوئی خوشبو کا رستا نہیں ہوتا
اچھا ہے کہ سیلاب کا رُخ موڑ دیا ہے
مر جاتا اگر کھل کے میں رویا نہیں ہوتا
دھو دیتا ہے رستے کی سبھی گرد کو پھر بھی
بہتا ہوا پانی کبھی میلا نہیں ہوتا
تو ہے تو ترا عکس نظر آتا ہے ہر سو
دیوار نہ ہوتی تو یہ سایا نہیں ہوتا
مجبوریٔ دل کھینچ کے لائی ہے یہاں تک
یہ دستِ طلب ایسے تو پھیلا نہیں ہوتا

احساسِ زیاں ایسا کہ رونے نہیں دیتا
غم تیرا کسی اور کا ہونے نہیں دیتا
تو جب سے گیا، دل بڑا محتاط ہوا ہے
اک پل بھی تری یاد کو کھونے نہیں دیتا
کوئی تو مرے سر پہ ہے تانے ہوئے چادر
ان ہوئی کوئی بات جو ہونے نہیں دیتا
میں چاند ستاروں کا طلب گار نہیں ہوں
میں خود کو کبھی سپنے سلونے نہیں دیتا
پوچھے تو کوئی تنہا کٹی کیسے مری عمر
یہ ہجر کسی کو بھی کھلونے نہیں دیتا
پتھر کے زمانے کا میں انسان ہوں زاہدؔ
دکھ اپنے کسی اور کو ڈھونے نہیں دیتا

پاؤں پتھر ہو گئے اور آنکھ پانی ہو گئی
بات یہ ہونی تھی لیکن ناگہانی ہو گئی
وہ اگر رہتا تو رہتی تھی ادھوری داستاں
اُس کے جانے سے مکمل، اک کہانی ہو گئی
صاف آتا تھا نظر جب تک نظر شفاف تھی
آنکھ میلی ہو گئی تو بدگمانی ہو گئی
اس قدر ارزاں ہوئی ہر شے کہ فوراً بک گئی
اور اب بازار میں ہر سو گرانی ہو گئی
اب یہ آنکھیں کس طرح اس کے تعاقب میں رہیں
وہ مکاں سے اُٹھ گیا تو لامکانی ہو گئی
جاتے جاتے مجھ سے وہ کچھ بھی نہ کہہ پایا مگر
آنکھ سے آنسو گرا اور ترجمانی ہو گئی

دلوں کا کرب کسی پر عیاں نہیں ہوتا
یہ ایسی آگ ہے جس کا دھواں نہیں ہوتا
وہ عہدِ طفلی سے پیری میں پاؤں رکھتا ہے
کسی غریب کا بچہ جواں نہیں ہوتا
تم اس کو ڈھونڈنے جاؤ گے کل کہاں لوگو
گزرتے وقت کا کوئی نشاں نہیں ہوتا
زمیں نے چین سے رہنے کہاں دیا اُس کو
جو اپنے، واسطے خود آسماں نہیں ہوتا
وہ یاد کرتا ہے مجھ کو یہ مان لوں کیسے
یقیں کے شہر میں بابِ گماں نہیں ہوتا
یہ اور بات کہ میں آئینہ نہیں زاہدؔ
وگرنہ ہاتھ میں پتھر کہاں نہیں ہوتا

قصہ دل و نظر کا بیاں تک چلا گیا
یہ تھا مکیں کہاں کا، کہاں تک چلا گیا
زاہدؔ یہ زندگی تو سفر حوصلوں کا ہے
چلتا رہوں گا مجھ سے جہاں تک چلا گیا

اپنے ہونے کا حوالہ مجھے دینا ہوگا
میں دیا ہوں تو اُجالا مجھے دینا ہوگا

تسنیم کوثر / لاہور

شوق کتنا ہی سہی سیر دو عالم کا مگر
گھر سے پیارا نہیں کوئی بھی نگر جانتے ہیں

تسنیم کوثر کا تخلیقی سرمایہ کئی اصناف پر محیط ہے۔ افسانہ، سفرنامہ اور شاعری تینوں جہتوں میں وہ کئی سال سے لکھ رہی ہیں۔ رسائل میں ان کی نظم و نثر برابر شائع ہو رہی ہے اور ادبی ذوق سے بہرہ مند قارئین کو متوجہ کر رہی ہے۔ ان کا ایک سفرنامہ کتابی صورت میں طبع ہو چکا ہے اور دوسرے سفرنامے کی اقساط ایک معروف ادبی جریدے میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کے بہت سے افسانے رسائل میں چھپتے رہتے ہیں اور ان کے بارے میں بالعموم بہت اچھی رائے کا اظہار کیا جاتا ہے اور بالخصوص ان کے اسلوب نثر کو سراہا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں بھی کئی سال سے ادبی رسائل میں طبع ہو رہی ہیں اور ان کی بھی بہت ستائش ہوئی ہے۔ (خواجہ محمد زکریا)

رنگ بھرنا کبھی خاکوں میں کہانی لکھنا
داستاں غم کی کوئی یاد پرانی لکھنا
دیکھنا جو بھی سمو دینا اُسے لفظوں میں
کبھی اوروں کی کبھی اپنی کہانی لکھنا
کھولنا جب کبھی گزرے ہوئے لمحوں کے کواڑ
صبح ارمان بھری شام سہانی لکھنا
پہلے رکھ دینا چراغوں کو سرِ راہگزر
پھر کسی بھٹکے مسافر کی کہانی لکھنا
کبھی رم جھم، کبھی خوشبو تو کبھی بادِ نسیم
اُس کے لہجے کو بہاروں کی جوانی لکھنا
یاد میں اُس کی جو پلکیں کو بھگو دیتے ہیں
اُن کو موتی ہی نہیں لعل یمانی لکھنا
درد اور پیار میں کیا رشتہ ہے اس کو بھی کبھی
دے جو مہلت تمہیں اشکوں کی روانی لکھنا
چند اشعار سے کیا ہوگی تسلی تسنیم
لکھنے بیٹھی ہو تو اب ساری کہانی لکھنا

دیے کو دل لگی مہنگی پڑے گی
ہوا سے دوستی مہنگی پڑے گی
مخالف پر بھروسہ کر لیا ہے
اُسے یہ سادگی مہنگی پڑے گی
زمانہ جان لے گا دل کی باتیں
یہ آنکھوں کی نمی مہنگی پڑے گی
خزاں بیٹھی ہے اب نظریں جمائے
کلی کو بے خودی مہنگی پڑے گی
کوئی جب ذکر چھیڑے گا تمہارا
ہمیں وابستگی مہنگی پڑے گی
غم دل کو چھپا کر ہنسنے والے
تجھے جھوٹی ہنسی مہنگی پڑے گی
سمندر کو بھی پانی کی طلب ہے
اُسے یہ تشنگی مہنگی پڑے گی

کتنے کانٹوں سے بھری ہے یہ ڈگر جانتے ہیں
کیسا مشکل ہے محبت کا سفر جانتے ہیں
اب نہیں دوریٔ منزل کا کوئی خوف ہمیں
آبلہ پائی کو سہنے کا ہنر جانتے ہیں
ہم نے کب تم کو بتایا ہے محافظ اپنا
کیسے کرنا ہے ہمیں اپنا سفر جانتے ہیں
ہم نے دیکھے ہیں بدلتے ہوئے دنیا کے چلن
کیسے انداز کی ہے کس کی نظر جانتے ہیں
شوق کتنا ہی سہی سیر دو عالم کا ہمیں
گھر سے پیارا نہیں کوئی بھی نگر جانتے ہیں
یہ جو طوفاں ہمیں لے آتے ہیں ساحل کی طرف
یہ ہے سب ماں کی دعاؤں کا اثر جانتے ہیں
ہم بھی تسنیم رہے شام و سحر گردش میں
اپنی رُوداد کو یہ شمس و قمر جانتے ہیں

شام نے دھیرے دھیرے در کھولے
رات اُتر آئی بال و پر کھولے
شہر کا شہر غم میں ڈوب گیا
کون ایسے میں بام و در کھولے
دل کے اُجڑے ہوئے جزیرے میں
آس بیٹھی ہے اپنے پر کھولے
گرد اُڑتی ہو جب کدورت کی
کون بابِ دل و نظر کھولے
چاندنی رات نے کیا جادو
یاد کے آج سارے در کھولے
حُسن سے اپنے بے خبر تھی
رنگ بکھرائے جب بھی پر کھولے

عکس تیرا دکھا رہا ہے مجھے
آئینہ پھر ستا رہا ہے مجھے
میں نے سوچا تھا بھول جاؤں گی
تو مگر یاد آ رہا ہے مجھے

افضل گوہر/ پھلروان

تیری دُنیا میں یہ دل اس لیے گھبراتا ہے
اس سرائے میں کوئی آتا ہے کوئی جاتا ہے

افضل گوہر غزل کے منفرد اور صاحب اسلوب شاعر ہیں۔ ان کے پانچ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلے شعری مجموعے "اچانک" سے شروع ہونے والا اُن کا ادبی سفر "ہجوم"، "رتق"، "ہم قدم" اور "خوش نما" سے ہوتا ہوا اب "نمود خاک" کی طرف گامزن ہے۔ اُن کی غزل میں تازگی، شگفتگی اور جدت ہے۔ وہ عام ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُس میں کافی حد تک کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ افضل گوہر محبت کرنے والے انسان ہیں۔ شعر و ادب میں اپنے نام اور مقام کے ساتھ ساتھ وسیع حلقہ احباب بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کے ذریعے جتنی محبتیں سمیٹی ہیں وہ بہت کم شعراء کے حصے میں آئی ہیں۔ اُن کی شاعری ہی ان کی شخصیت کا اصل تعارف ہے۔ (افتخار شوکت)

آئی تھی اس طرف جو ہوا کون لے گیا
خالی پڑا ہے طاق، دِیا کون لے گیا
اس شہر میں تو کوئی سلیمان بھی نہیں
میں کیا بتاؤں تختِ سبا کون لے گیا
دشمن عقب میں آ بھی گیا اور ابھی تلک
تم کو خبر نہیں ہے عصا کون لے گیا
اپنے بدن سے لپٹا ہوا آدمی تھا میں
مجھ سے چھڑا کے مجھ کو بتا کون لے گیا
گوہر یہ ماجرا تو پرندوں سے پوچھنا
پیڑوں کو کیا پتہ ہے ہوا کون لے گیا

شکست کھا کے بھی کب حوصلے ہیں کم میرے
مرے کٹے ہوئے ہاتھوں میں ہیں علم میرے
پناہ گاہ مجھے بھی تو نُور جیسی دے
مری تلاش میں دشمن ہیں تازہ دم میرے
تجھے میں کیسے بتاؤں کہاں سے کیسا ہوں
اُلجھ رہے ہیں بدستور پیچ و خم میرے
کس آسمان کی وسعت تلاش کرتے ہوئے
زمیں سے دور نکل آئے ہیں قدم میرے
تو یہ سوال بھی اب دجلہ و فرات سے پوچھ
میں کیا بتاؤں کہاں لٹ گئے حرم میرے

جمی رہی ہے چٹانوں پہ برف صدیوں تک
تو جا کے تب کہیں پتھر ہوئے ہیں نم میرے

نیند آئی نہ کھلا رات کا بستر مجھ سے
گفتگو کرتا رہا چاند برابر مجھ سے
اپنا سایہ اُسے خیرات میں دے آیا ہوں
دھوپ کے ڈر سے جو لپٹا رہا دن بھر مجھ سے
کون سی ایسی کمی میرے خد و خال میں ہے
آئنہ خوش ہوتا کبھی مل کر مجھ سے
کیا مصیبت ہے کہ ہر دن کی مشقت کے عوض
باندھ جاتا ہے کوئی رات کا پتھر مجھ سے
دشت کی سمت نکل آیا ہے میرا دریا
بس اسی پر ہیں خفا سارے سمندر مجھ سے
اپنے ہاتھوں کو جو کشکول بنایا گوہر
گر پڑا جانے کہاں میرا مقدر مجھ سے

تیری دُنیا سے یہ دل اس لیے گھبراتا ہے
اس سرائے میں کوئی آتا ہے کوئی جاتا ہے
تو نے کیا دل کی جگہ رکھا ہے پتھر مجھ میں
غم سے بھر جاؤں بھی تو رونا نہیں آتا ہے

وہ مرے پیار کی گہرائی سمجھتا ہی نہیں
راستہ دور تلک جائے تو بل کھاتا ہے
پھر بھلا کس کے لیے اتنی چمکتی ہے یہ رات
کوئی دریا بھی نہیں ہے جو کہیں جاتا ہے
اُس کے ہاتھوں میں وہ پرکار ہے جس سے گوہر
گھوم جاتی ہے زمیں آسماں چکراتا ہے

سب کو بتا رہا ہوں یہی صاف صاف میں
جلتے دیے سے کیسے کروں انحراف میں
میں نے تو آسمان کے رنگوں کی بات کی
کہنے لگی زمین بدل دوں غلاف میں
گمراہ کب کیا ہے کسی راہ نے مجھے
چلنے لگا ہوں آپ ہی اپنے خلاف میں
ملتا نہیں ہے پھر بھی سرا آسمان کا
کر کر کے تھک چکا ہوں زمیں کا طواف میں
اب تو بھی آئنے کی طرح بولنے لگا
پتھر سے بھر نہ دوں تیرے منہ کا شگاف میں

کنور امتیاز احمد / لاہور

بچے بوڑھے ہو جاتے ہیں   یہ نقصان جوانی میں ہے

کنور امتیاز احمد ایک درویش منش شاعر ہیں۔ انھوں نے دُنیا کو ایک صوفی کی نظر سے دیکھا ہے۔ اُن کی شاعری میں فکر، پیغام اور فلسفہ ہے۔ وہ ایک خاص فضا میں اور ایک خاص سوچ کے زیرِ اثر غزل کہتے ہیں۔ اس جہاں اپنے مناسب تصور نہ کرنے والے کنور امتیاز نے خیالوں اور خوابوں میں اپنے لیے ایک علیحدہ جہاں تخلیق کرلیا ہے۔ خواب اُن کی شاعری کا بنیادی استعارہ ہے۔ ''خواب میں گزرے دن'' اُن کا پہلا شعری مجموعہ ہے جسے ادبی حلقوں میں سنجیدگی سے پڑھا گیا اور اس کی پذیرائی ہوئی۔ (ارژنگ)

جبکہ اس دنیا میں تجھ سا کچھ نہیں
اس کا مطلب ہے کہ دنیا کچھ نہیں
میری حالت کا سبب کچھ اور ہے
جیسا تم سمجھے ہو ویسا کچھ نہیں
پہلے کچھ دن اس کی لگتی ہے کمی
اور پھر دنیا میں بچتا کچھ نہیں
میرا ہونا یا نہ ہونا تجھ سے ہے
تو ہے تو سب کچھ ہوں تنہا کچھ نہیں
ایسے کیسے زندگی گزرے کنور
سوچتا کیا کچھ ہوں، ہوتا کچھ نہیں

کیا کیا بتاؤں تمھیں کون تھا وہ کیسا تھا
بس ایک خواب تھا جو جاگتے میں دیکھا تھا
ترے فراق میں بے آسرا نہیں تھا میں
ترا خیال مجھے پوچھنے کو آتا تھا
وہ شخص سامنے جس کے پلک نہیں جھپکی
پلک جھپکتے ہی گزرے دنوں کا قصہ تھا
یہ وہم تھا کہ مرے ساتھ ساتھ ہے کوئی
یہ وہم تھا کہ مرے ساتھ میرا سایہ تھا
وہ جانتا تھا کہ مجھ میں نہیں ہے تاب اتنی
وہ شخص میرے لیے مجھ سے دور رہتا تھا

کسی بہانے ہی آ گئے یہاں ورنہ
تری زمیں پہ بھلا کون پاؤں دھرتا تھا

پہلے یونہی دیکھتے رہنے کی عادت ہو گئی
اور پھر اک دن مجھے اُس سے محبت ہو گئی
زندگی کو زندگی کرنا کہاں آسان تھا
اُس کی آنکھوں کی مگر مجھ پر عنایت ہو گئی
عشق میں تیزی سے چل کے عمر بھر کو گر گئے
کام تھا تاخیر کا! یاروں سے عجلت ہو گئی
میرے ان کے درمیاں بس حوصلے کا فرق تھا
زندگی ان کو مصیبت، مجھ کو نعمت ہو گئی
میں جو اپنے آپ کا رکھنے لگا اتنا خیال
مجھ کو اپنے آپ سے کیسے محبت ہو گئی
ایک تجھ سا شخص مجھ کو آئنے میں کیا ملا
آئنے کے سامنے رہنے کی عادت ہو گئی
ایک خواہش تھی کسی کے قرب کی مجھ میں کنور
ایک خواہش تھی جو آخرکار حسرت ہو گئی

مجھ سے یہ کون شب و روز کہا کرتا ہے
جو ہوا کرتا ہے وہ ٹھیک ہوا کرتا ہے
بات بنتے ہی بگڑتی ہے اچانک میری
پھول کھلتے ہی کوئی توڑ لیا کرتا ہے

ہم بھی دیکھنے کو بیٹھ رہے محفل میں
کوئی کیسے نظر انداز کیا کرتا ہے
تم تو اک بات کو دل سے ہی لگا بیٹھے ہو
ایسی حالت میں کوئی ساتھ رہا کرتا ہے
تیرے غم میں بھی کوئی بات ہے تیرے جیسی
یہ بھی مجھ پر یونہی بے بات ہنسا کرتا ہے
کچھ تو یہ سن کے بھی روتی رہیں آنکھیں میری
روئی آنکھوں کو کوئی چوم لیا کرتا ہے
مان بھی لوں ترے کہنے پہ کہ میں ہوں پھر بھی
ہونے ہونے میں بہت فرق ہوا کرتا ہے

سمجھا رہی ہے کب سے، مرا مسئلہ مجھے
دنیا سمجھ رہی ہے خدا جانے کیا مجھے
وہ کہہ رہا ہے اس کو بھلا دوں کس طرح
اور یاد آ رہا ہے کوئی واقعہ مجھے
دنیا ملول ہے مری حالت کو دیکھ کر
تیرا خیال کیسے یہاں آ گیا مجھے
سنتا نہیں ہوں کچھ بھی مگر دیکھتا تو ہوں
احباب دے رہے ہیں کوئی مشورہ مجھے
تیرا فراق یوں بھی مجھے راس آ گیا
تجھ سے عزیز تر تھا تجھے سوچنا مجھے

نسیم عباسی / ایبٹ آباد

پھر بھی نجانے کیا کمی تصویر میں رہی
ہم نے ترے نقوش تو سارے بنائے تھے

نسیم عباسی کی غزل اس تازہ کاری سے مملو ہے جس میں اظہار کے سانچے ایک نئی دروبست کے ساتھ عصری حقائق کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ اس کے ہاں لفظی علامات اپنی نئی تعبیرات کے ساتھ ہمیں ایسے تجربات واحساسات سے ہم آہنگ کرتے ہیں کہ جن کی تشکیل کا عمل عہد جدید تر کی بوسیدہ روایت کے اعلامیے سے عبارت ہے۔ انسانی احساس اور تجربا پے معمولات کے آئینے میں اسی طرح عکس پذیر ہوتا رہا ہے کہ جس طرح صدیوں پہلے اس کا انعکاس روبکار ہوتا تھا مگر جدید دور کے منظرنامے کی یکسر تبدیلی اور معروضیت کی وہ تفہیم کہ جو صدیوں پہلے ہمارا فکری اثاثہ تھی اب بالکل متغیر ہو چکی ہے۔ اس اعتبار سے روایتی شاعری کے مقررہ پیمانے اب نئی لفظی ومعنوی تشکیلات کے متقاضی ہیں۔ نسیم عباسی کا شعر بھی انہی نئی تشکیلات کے تناظر میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ جملہ خصوصیات نسیم عباسی کی شعریات میں کسی اکہری سمت کی عکاس نہیں ہیں بلکہ قاری کے لیے کثیرالجہتی تفہیم کے دروا کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا شعری وجدان معاصر منظرنامے میں اپنے تخلیقی رنگ اس طرح بھرتا ہے کہ وجود میں آنے والی تمثالیں عصری حسیت کی روشنی میں اپنے خدوخال وضع کرنے لگتی ہیں۔ (ڈاکٹر محمد سفیان صفی)

مرے وجود کا اب تک خیال رکھا ہے
برتنے والے نے برتن سنبھال رکھا ہے
میں اُس کو زندگی کہنے میں حق بجانب ہوں
کہ اُس نے موت کے وعدے پہ ٹال رکھا ہے
کرو یہیں سے مرمت گری ہوئی دیوار
تہِ اساس تیشوں کا مال رکھا ہے
یہ اور بات کہ ہے ڈور ٹوٹنے والی
کنویں میں ڈول تو پیاسے نے ڈال رکھا ہے
عجیب سمت نمائی سفر میں کی اُس نے
مرے جنوب کی جانب شمال رکھا ہے
میں اُس کو اپنا خدا ماننے پہ ہوں مجبور
مرے ضمیر نے جو خوف پال رکھا ہے
ذرا سی دیر لگے گی بدن کو گرنے میں
زمیں نے گیند کو اوپر اُچھال رکھا ہے
وہ ہاتھ اُس کا کسی دوسرے کی جیب میں ہے
جو اپنی جیب سے باہر نکال رکھا ہے
جدید عہد کے شوکیس میں کوئی مجھ سا
برائے نام بطور مثال رکھا ہے
کیا ہے نصب یہ کس رُخ پہ تو نے آئینہ
کہ میرا عکس بھی بے خدوخال رکھا ہے
میں پیاس مار کے چشموں سے لوٹ آیا ہوں
نسیم دھوپ نے پانی اُبال رکھا ہے

جس وقت اُس نے بخت ہمارے بنائے تھے
میلی ہتھیلیوں پہ ستارے بنائے تھے
کچھ پنچھیوں نے گھونسلے پیڑوں کے جھنڈ میں
اونچی جگہوں پہ خوف کے مارے بنائے تھے
حسبِ مراد دستِ ہنر بولنے لگا
گونگے نے چند ایسے اشارے بنائے تھے
پھر بھی نجانے کیا کمی تصویر میں رہی
ہم نے ترے نقوش تو سارے بنائے تھے
میں نے بس ایک نہر نکالی تھی ہاتھ سے
دریا نے آپ اپنے کنارے بنائے تھے
کچھ زندگی بجاو عزیزاں ضرور تھی
کچھ دوست ہم نے جان سے پیارے بنائے تھے
ہم نے حیا چمن کے محبت شعار کی
گڑیوں کے واسطے بھی غرارے بنائے تھے
دل میں نسیم حُسن کی تکمیل کے لیے
آنکھوں نے کیسے کیسے ادارے بنائے تھے

عجیب ضد ہے محبت میں اُس کے ساتھ مری
کہ میرے ساتھ جیے میرے ساتھ مر جائے
نمودِ حُسن جوانی ہے عمر کی صورت
بدن زوال سے پہلے عروج پر جائے
حدودِ ذات سے آگے خداؤں کی حد ہے
میں سوچتا ہوں اگر ذہن کام کر جائے
وہ بادِ تند ہے ہر پیڑ کی یہ کوشش ہے
ہوا کے ساتھ کوئی دوسرا شجر جائے
بھری پڑی ہے عفونت سے انچ انچ زمیں
اس ایک پھول کی خوشبو کدھر کدھر جائے
ہے کوئی دیر سے اُس پار منتظر میرا
رُکا ہوا ہوں کہ ندی ذرا اُتر جائے
ابھی تلک ترے رستے میں پُل صراط پہ ہے
گزرنے والا ضروری نہیں گزر جائے
نسیم گاؤں کی مسجد میں رات کاٹے گا
اِک اجنبی سا مسافر ہے کس کے گھر جائے

جہاں جہاں بھی ہوس کا یہ جانور جائے
دلوں سے مہر و محبت کی فصل چر جائے
وہیں پہ ہوں میں جہاں سے دکھائی دیتا ہوں
وہیں تلک ہوں جہاں تک مری نظر جائے

ہوس جو تیرے خدوخال میں ڈھلنا چاہے
خواہشِ وصل مری جنس بدلنا چاہے
ایک مدت سے مرا ہاتھ ہے بالکل خالی
ہاتھ سے پھر بھی کوئی چیز نکلنا چاہے

غضنفر عباس/ساہیوال

ڈھلا جو دن تو فروزاں ہوئے سخن کے چراغ   دلوں کا کتنا تعلق سکوت شب سے ہے

میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاعری کیا ہے؟ ہمارے اندر پھیلی ہوئی خاموشی کا نغمہ یا پھر ہمارے باہر بھی ہوئی خاموشی کی آوازوں کا نوحہ۔ ایک مسرت آمیز دکھ یا پھر دکھوں سے لبریز کوئی والہانہ مسرت آمیز لمحہ، تنہائی کا آشوب یا چیختی آوازوں کا سناٹا، عشق کی جنوں خیزی سے نمو پذیر ہونے والے موسموں کی آگہی کے دو رنگ روپ جو ہمیں ہجر و وصال کی بارشوں میں نڈھال اور بے حال رکھتے ہیں اور پھر جیسے کوئی ان کیفیتوں کی موسیقی ترتیب دینے لگتا ہو یا پھر اپنے مشاہدوں اور تجربوں کو بیان کرنے کی قدرت یا پھر اپنی مطالعاتی کشمکش کی آمیزش سے اپنے اطراف پھیلے ہوئے اندھیروں کی دستاویز پر روشنی کی مہر ثبت کرنے کا اعلان نامہ یا ایک ایسے خیال آفریں منظرنامے کا پھیلاؤ جس کی آب و ہوا ایک نئے جہان معنی سے ہمکنار کر دے یا پھر جذبوں کی سرشاری کا جمالیاتی سطح پر اظہار اور اس سے بھی آگے کے ایک مابعد الطبعیاتی محسوساتی نظام کی گردش جو آپ کو لہو میں رقص کرتی دکھائی بھی دے۔ ان تمام رویوں کا فکری اور تخلیقی سطح پر اظہار ہو بھی جائے تو کیا یہ شاعری بن جائے گا۔ میں شاعری کی کوئی واضح تعریف بھی نہ کر سکا سوائے اس کے کہ دلیل کے طور پر کوئی اچھا شعر، کوئی بہت گہری نظم سنا دوں جو ایک نشاط آمیز کرب کی کسی ماورائی لہر کو جنم دے دے اور آپ اپنے اندر شرابور ہو جائیں۔ ایک ایسی کیفیت سے جو شاید شاعری ہو۔ غضنفر عباس کی نظموں میں ایسی ہی کوئی لہر امڈی چلی آتی ہے۔ اس کی نظموں میں اتری ہوئی کہانیوں کے کردار چیختی پھرتی اور دکھائی دینے والی اجنبیت کے آئینہ خانے میں چہرہ نمائی کرتے ہوئے ہمیں ایسی کیفیت سے ہم آہنگ کرتے ہیں جیسے یہ کردار نظموں میں موجود کہانیوں کے اختتام پر دیے جلانا بھول گئے ہوں اور پھر اچانک ہوا کی کسی لہر نے احساس کے ساز پر ان نظموں کو دلوں کی طرح روشن کر دیا ہو۔ یہ دیے خیال و فکر کی ایسی روشنی میں نہائے ہوئے ہیں جو دلوں کی سرزمین پر اندھیرا نہیں ہونے دیتے۔ (سلیم کوثر)

کھلا نہیں مہتاب کہ روشن ہے شب تاب چراغ
عکس خیال ہے آنکھوں میں یا زیر آب چراغ
رکھے نہ وہ کیوں طاق دعا میں اس کی لو محفوظ
وسعت ظلمت میں ہو جس کا کل اسباب چراغ
دیکھیں اب کیا موج زمانہ اس سے کرے سلوک
سر پہ افق ہم دھر آئے ہیں اک خوناب چراغ
اپنی حسیں اخذ کریں گے جس سے لوگ سدا
سیل ابد میں سوچ مری ہے وہ نایاب چراغ
پل دو پل تو مل جاتی ہے اس دل کو تسکیں
مونس غم ہوں فرقت میں گر یاد کتاب، چراغ
اب بھی دشت میں گریہ کناں ہے یہ کیسی تمثیل
سیّد، نیزہ، گھوڑا، خیمہ، سر، اصحاب، چراغ
ہو نہیں سکتا اس میں غضنفر سایۂ زرد مقیم
کشت گماں میں جب تک باقی ہے شاداب چراغ

زاد سفر چراغ تھا صحرا لباس تھا
اہل طلب کا عشق میں سچا لباس تھا
اترا جو زینہ ہائے شب بے چراغ سے
اس جسم پر سحر کا دمکتا لباس تھا
لحظہ بہ لحظہ رنگ بدلتے جہان میں
چہرہ بہ چہرہ ایک انوکھا لباس تھا

موسم کے جزر و مد سے گزرنا پڑا انہیں
جن شاخچوں پہ سبزہ و گل کا لباس تھا
اور پھر سراغ بھی نہ ملا جن کے جسم پر
اجداد کے غرور کا ورثہ لباس تھا
احساس نے بنا تھا جو پیراہن خیال
عالم میں اپنی طرز کا یکتا لباس تھا
واجب ہے اس لیے بھی بہاروں کا احترام
سبزہ مرے وجود کا پہلا لباس تھا
عباس کیا یہ کم ہے سرکار زار زیست
ہم کشتگان شب کا سنہرا لباس تھا

ارزاں شہرت کی دھن میں بھی اہل قلم نے سطروں میں
پیرائے مجلک اپنائے اور نکتہ ابہامی رکھا
پھانسی سے مر کر بھی زندہ رکھا سچ کی حرمت کو
شاخ کے نیزے پر بھی لہجہ خوشبوئے الہامی رکھا
اُسوہ و اسم دلوں میں رکھا شبیری کرداروں کا
اور میدان عمل میں مقابل لشکر کوفی و شامی رکھا
قرض گلابوں سے نسبت کا واجب تھا سو ہم نے سفر میں
صحن گلستاں سے مقتل تک پیراہن گلفامی رکھا
فکر جدید سے جوڑے رکھا ہم نے غضنفر حسن کہن
شورش فن و ہنر میں ہم نے تازہ طرز گرامی رکھا

نہ خال و خد سے نہ تزئین چشم و لب سے ہے
فروغ حسن تو سیرت کی تاب و تب سے ہے
یہ نور ہے جو مرے اردگرد پھیلا ہوا
مرے ضمیر، مری رُوح کے سبب سے ہے
اور اب ہے پاس مرے جو بھی کچھ نشاط و الم
یہ سب میسر و موجود کی طلب سے ہے
ڈھلا جو دن تو فروزاں ہوئے سخن کے چراغ
دلوں کا کتنا تعلق سکوت شب سے ہے
خدایا کیوں ہیں یہ عشاق اب ذلیل و حقیر
اگر یہ عشق ترے فعل مستحب سے ہے
زمانہ کیوں ہے یہ اس درمیاں میں اٹکا ہوا
کہ میرا شکر و شکایت تو اپنے رب سے ہے
ہر آدمی ہے مجھے دل و جان سے بڑھ کے عزیز
بھلے وہ جس بھی کسی مکتب و نسب سے ہے
میں کر رہا ہوں نئے معرکے کی صف بندی
سو اب کے وار مجھے احباب کے عقب سے ہے
کوئی تو لائے غضنفر تمام تو کی ہوا
فضائے صبح وطن محو یاس کب سے ہے

عامر سہیل / بہاولنگر

میں ویرانے میں بانہوں کو پھیلاتا ہوں
مجھ سے ملنے کوئی بیل ہری آتی ہے

شاعری تخیل کو پھیلاتی اور زبان کو سکیڑتی ہے۔ یعنی انسانی شعور کائنات کے نئے نئے رُخ اُجاگر کرتی ہے جبکہ ان کی جمع شدہ چربی کو کاٹ کاٹ کر الفاظ کو ان کی خالص شکل میں کھڑا کرتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایک محاورے کی صورت اختیار کر کے انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ میرے خیال میں بہت سے لوگوں کی آراء کو دیوان پر چھاپنا مفید نہیں رہتا۔ اس سے شاعری اپنی آواز دب جاتی ہے۔ عامر سہیل کی آواز نئی بھی ہے اور انوکھی بھی۔ اُمید ہے کہ یہ آواز پھیلتی جائے گی۔ (عبداللہ حسین)

وجود جو کہ ثنائے لہو سے خالی ہے
یہ پنجہ ہائے رعونت نمو سے خالی ہے
مگر وہ عشق جو خوں میں نہا نہیں پایا
مگر وہ حسن جو آبِ وضو سے خالی ہے
یہ طوقِ پیرہن عشق و عاشقی کا خروش
کھنک ہے وقت کی اور آرزو سے خالی ہے
تری زمینوں پہ تیرے ہی رزق کا محتاج
گدائے عصر ہے اور راز تو سے خالی ہے
اسے نیاز سے بھر دے اسے سبو کر دے
یہ ایک دل جو نیازانہ خو سے خالی ہے
میں تیری سمت روانہ ترے توجع کو
اُچھالتا ہوں سے پہ جو ہُو سے خالی ہے
اُٹھا یہ گھٹا جدائی کا سر کے کاسے پر
ہٹا کہ پشت پہ پانی، سبو سے خالی ہے
بدن جمال کے رُخ پر رہیں کہ راہ ملے
اگر شمال کی گھاٹی عدو سے خالی ہے

سوتا ہوں سپنے میں ایک پری آتی ہے
سپنا دیکھ کے عامر آنکھ بھری آتی ہے
دل رکھتی ہو مٹی میں دھڑکاتی بھی ہو
اور اس باب میں تم کو جادوگری آتی ہے
میں ویرانے میں بانہوں کو پھیلاتا ہوں
مجھ سے ملنے کوئی بیل ہری آتی ہے

حمد کا جام لیے جاتا ہوں، دو قدموں پر
تجر گھومنے والوں کی نگری آتی ہے
اُن سے پوچھو جن کے پاؤں کٹ جاتے ہیں
مٹی میں دل رول کے ہم سفری آتی ہے
خوش آتا ہے چاک گریبانی کا موسم
شاعری ہوتی ہے اور بے خبری آتی ہے
محسن فروشوں کو عامر معلوم نہیں ہے
اس کی آنکھیں دیکھ کے خوش نظری آتی ہے

آنکھوں نے بھر دیا ہے تماشا وجود میں
کچھ بھی نہیں پڑا ہے زیاں اور سود میں
اِک عام آدمی کی طرح عمر ہو بسر
بس ایک محبتوں کا رجز ہو سرود میں
یہ پیرہن مجاز کا بدلے تو کچھ کھلے
کیا کچھ رکھا ہے میرے قیام و قعود میں
تیرے گداز جسم کو میلا نہیں کیا
میں نے تو عشق کو بھی رکھا ہے حدود میں
اے ساکنانِ اسود و ابیض پڑے رہو
نافِ زمین پر اُنہی کہنہ قیود میں
میلا بہت کیا جسے دنیا نے روز و شب
اُجلا بہت تھا جسم وہ اٹ کر بھی دُود میں
عامر یہ چلتے پھرتے فرشتے زمین کے
قوم منافقاں میں ہوں یا قوم ہود میں

اپنی آہوں سے جلے جاتے ہیں
شعر ہم کہتے چلے جاتے ہیں
اُنہی راہوں سے جہاں ہم گزرے
کچھ برے اور بھلے جاتے ہیں
تیری آنکھوں کی مسیحائی میں بھی
اشک آنکھوں میں گلے جاتے ہیں
ہاتھ گستاخ ہیں بے صبری سے
تیرے ہونٹوں کو ملے جاتے ہیں
دھات تکسیر سے بنتی ہے تو ہم
خود بھی آہن میں ڈھلے جاتے ہیں
یار اے یار ترے خیمے کی سمت
ہم بھی گرتے سنبھلتے جاتے ہیں
شام کے وقت یہ طائر عامر
کسی پیاں کے تلے جاتے ہیں

ویرانی نے دیکھ لیا ہے گھر کا سونا کونا بھی
آتے آتے آ جائے گا دیواروں کو رونا بھی
پیدل سڑکوں پہ چلنا اور فواروں پہ جھک جھک کر
دھیان تمہارا بھی رکھنا اور سوکھے ہونٹ بھگونا بھی
زخموں کی افزائش کرنا تجر کی فہمائش سے
روز لہو کے دھبے عامر پھر سینے سے دھونا بھی

شبہ طراز / لاہور

کیوں مجھے دیکھتے ہی اس نے جھکا لیں نظریں
بات چھوٹی سی ہے پر ہے تو پریشانی کی

شبہ طراز کا تعلق ممتاز علمی ادبی گھرانے سے ہے۔ اُن کی والدہ عذرا اصغر اُردو کی مایہ ناز افسانہ نویس ہیں۔ والد اصغر مرحوم بھی شاعر تھے اور شوہر جشیم عباس بھی معروف شاعر ہیں۔ شبہ طراز ہمہ جہت شخصیت کی مالک آرٹ کے تمام شعبوں سے اُن کو دلچسپی ہے۔ مصوری اور شاعری تو اُن کے جمالیاتی شعور کی مظہر ہیں۔ شبہ طراز نظم و غزل کہنے میں یکساں کمال رکھتی ہیں۔ وہ سادہ اور آسان زبان میں زندگی کے بڑے بڑے موضوعات کو نہایت سلیقے اور ہنرمندی سے بیان کرتی ہیں۔ اُن کی شاعری میں فلسفیانہ رنگ بھی ہے اور رومانوی حسن بھی۔ اُن کی شاعری صاف شفاف اور لطیف جذبوں کی ترجمان ہے۔

سمندر کا کوئی کردار بھی ہے
ادھر ہے کچھ تو کچھ اس پار بھی ہے
محبت زندگی جیسی کوئی شے
محبت باعث آزار بھی ہے
بہت گہری سمندر کی سی آنکھیں
سمندر آنکھ میں تیار بھی ہے
ہوائیں گیت اور لمبی جدائی
سفر ہے، راستہ دشوار بھی ہے
اگر جانا ہی نہ چاہے مسافر
ہے یوں تو ناؤ بھی پتوار بھی ہے
وہیں پہنچے چلے تھے ہم جہاں سے
اگر ہے دائرہ، پرکار بھی ہے
کھڑی ہے عقل بھی ششدر یہاں پر
یہاں اک دل سا ناہنجار بھی ہے

زندگی تنگ کیوں کی ہوئی ہے
یہ خوشی آپ ہی کی دی ہوئی ہے
آپ کے ساتھ جتنے سانس جیے
بس وہی اپنی زندگی ہوئی ہے
اُڑے پھرتے ہیں ابر آوارہ
ڈولتے ہیں کہ جیسے پی ہوئی ہے
شام ہونے سے پہلے لوٹ آئے
دیکھ کر آپ کو خوشی ہوئی ہے
ہونے کو دائم ہو بھی سکتی ہے
گو ملاقات سرسری ہوئی ہے
زخم زخم ہو گی، تھی شال بدن
جگہ جگہ سے ہم نے سی ہوئی ہے
کیا وہ سورج سے پہلے آئے نکل
رات باقی ہے روشنی ہوئی ہے
کیا خبر کب یہ وقت ٹل جائے
دل کی دل سے ابھی جمی ہوئی ہے
دھیمی دھیمی سی آنچ ہے باقی
آگ اس راکھ میں دبی ہوئی ہے

زندگی شکریہ تو نے جو مہربانی کی
آخری سانس تلک میری نگہبانی کی
کیوں مجھے دیکھتے ہی اس نے جھکا لیں نظریں
بات چھوٹی سی ہے پر ہے تو پریشانی کی
اُن کے سجدے کے نشاں پر یہ جبیں رکھنے سے
تمکنت اور بھی بڑھ جائے گی پیشانی کی
ایک پل دنیا کی نظروں سے ہوئے تھے اوجھل
ہم نے بھی دل کی سنی اس نے بھی من مانی کی
کتنا دنیا نے کہا دل نہ لگاؤ مجھ سے
کون سنتا ہے مگر بات بھی دیوانی کی
آسماں اور ہوا اور زمیں پیدا کر
حد ہوئی جاتی ہے اب بے سروسامانی کی
ہم نے دل دے دیا بس ایک نظر کے بدلے
کوئی قیمت تو ادا کرنی تھی نادانی کی

ساتھ ہیں یادیں تمہاری اور ہم
رقص میں ساری کی ساری اور ہم
سب زوالِ عمر کے ہیں سلسلے
زندگی "اللہ سنواری" اور ہم
دور تک دشت گماں اور خامشی
وقت کی منظر نگاری اور ہم
سائے سے اپنی طرف بڑھتے ہوئے
موت کی مردم شماری اور ہم
سوچتے ہیں کچھ تو کر جاتے ہیں کچھ
کیفیت ہے اضطراری اور ہم
خاک کے زندان میں بند خواہشیں
سانس ہے بے اختیاری اور ہم

مرتضیٰ ساجد/ساہیوال

فلک حیران ہے یہ کس کا گھر ہے　　　کوئی آہٹ نہ دستک ہے، نہ در ہے

ذہانت کا سفر روزِ اوّل سے جاری ہے۔ مرتضیٰ ساجد اسی سفر کا نمائندہ شاعر ہے جو لفظوں کا لوچ، بلند سوچ، بحروں کی موسیقیت اور شعریت کا مترنم لہجہ لے کر "لمحوں کے گرداب" کی صورت ادب کے اُفق پر اُبھرا ہے۔ اس میں صنائع، بدائع کے ادبی محاسن، الفاظ کی چست بندش، ندرتِ خیال، تخیل کی اُڑان، جدیدیت اور خوبصورت تراکیب کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ دورِ حاضر کے خارجی اور داخلی عوامل کو مدِنظر رکھ کر رنگِ تغزل میں لکھنے والوں کے میرِ کارواں ثابت ہوں گے اور ادبی حلقوں میں ان کی اس پہلی کاوش کو سراہا جائے گا۔ آنے والا دور اُن کا مقام و مرتبہ خود متعین کرے گا۔ (قمر حجازی)

کیسے بسر کروں کہ فضائیں نہیں رہیں
اے زندگی وہ تازہ ہوائیں نہیں رہیں
اب تو غموں کی دھوپ میں جلتا ہے یہ وجود
لگتا ہے ماں کی دُعائیں نہیں رہیں
تقسیم ہو گئے تری خواہش کے خد و خال
اب ہجرتوں کی سر پہ بلائیں نہیں رہیں
سہمے ہوئے ہیں خوف سے گلیاں اُداس ہیں
بچوں کے پاس جس طرح مائیں نہیں رہیں
کیسی اندھیر نگری میں بستا ہوں اے خدا
ہر سمت تیرگی ہے ضیائیں نہیں رہیں
اِک در کا مل گیا ہے مجھے گوشۂ اماں
بے مہر موسموں کی ہوائیں نہیں رہیں
جھوٹی تسلیوں کا سفر کر رہے ہیں لوگ
ورنہ کسی کے پاس انائیں نہیں رہیں
وہ دن وہ اضطراب مسلسل وہ رتجگے
وہ فن شاعری کی عطائیں نہیں رہیں
یا موسموں نے کر دیا ہے کھوکھلا وجود
یا پیڑ کی زمین سے وفائیں نہیں رہیں
بستی کے ہر خدا کو ہے میری طلب ہی کیوں
کیا اب کسی پہ ان کی جفائیں نہیں رہیں
ساجد یقین عشق کا پہلا جواز ہے
شک ہے تو پھر کہو کہ وفائیں نہیں رہیں

جو نگاہِ شوق کا مرکز بنا وہ کون تھا
نام جس کے میں نے جیون کر دیا وہ کون تھا
میری آنکھوں میں تو باقی رتجگے ہی رہ گئے
ساتھ جو سارے ہی منظر لے گیا وہ کون تھا
تو بھی کچھ جانتا ہے اے مرے سچے خدا
جو سدا میری دُعاؤں میں رہا وہ کون تھا
تیرے لاکھوں رازداں تھے اب پتا کیسے چلے
جس نے تجھ کو شہر میں رُسوا کیا وہ کون تھا
پوچھتے ہیں لوگ کہ رُسوائیوں کے خوف سے
تجھ سے جو روتے ہوئے رُخصت ہوا وہ کون تھا
تو خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر یہ بتا
دوریوں کا فیصلہ جس نے کیا وہ کون تھا
تلخ لمحوں کی سلگتی بستیوں میں رات دن
جس نے جینے کا دیا تھا حوصلہ وہ کون تھا
جو تصور میں مہکتا ہے گلابوں کی طرح
کچھ تو ہو معلوم کہ وہ کون تھا وہ کون تھا
مرتضیٰ ساجد یہی تو سوچتا ہوں رات دن
مجھ کو گلیوں میں جو رُسوا کر گیا وہ کون تھا

فلک حیران ہے یہ کس کا گھر ہے
کوئی آہٹ نہ دستک ہے نہ در ہے

اے شہرِ یار تیری جستجو کا
وہی قدموں تلے پھیلا سفر ہے
وہ تقدیریں بدل دیتا ہے پل میں
مری جاں مانگنا بھی اِک ہنر ہے
کسی کو راس آ جاتا ہے جینا
کسی کی زندگی اُمید پر ہے
دُعائیں سوچ رکھیں ہیں بہت سی
مگر اپنے مقدر کا بھی ڈر ہے
حقارت سے جسے دیکھا ہے تو نے
اسی مجذوب کو سب کی خبر ہے
کوئی لمحہ نہیں آسودگی کا
عجب اِک بوجھ میری روح پر ہے
تکبر ہے کوئی نام و نسب کا
مرے کاندھوں پہ کب میرا ہی سر ہے
سرِ آئینہ ہے اِک اجنبی جو
کہیں دیکھا ہوا کوئی بشر ہے
اگر ہوں بانجھ تقدیریں تو سمجھو
دُعا کی گود میں کوئی تو ثمر ہے
جنھیں ترتیب دیتے ہیں فرشتے
مری اُن زائچوں پر بھی نظر ہے
وہی تو چھینتا ہے سب کی خوشیاں
جو اس بستی میں سب سے معتبر ہے
مجھے کب مرتضیٰ ساجد ملے گا
تمہاری چاہتوں کا جو نگر ہے

عنبرین حسیب عنبر/کراچی

دنیا تو ہم سے ہاتھ ملانے کو آئی تھی
ہم نے ہی اعتبار دوبارا نہیں کیا

عنبر ایک سلیقہ مند شاعرہ ہے اور اظہار و بیاں کے تقاضوں کا شعور رکھتی ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ تہذیب و شائستگی کے دائرے میں رہتے ہوئے کون سی بات کہی جائے گی اور کون سی اَن کہی رہے گی۔ اس کے ہاں جذبے اور احساس کا اظہار نمایاں ہے لیکن اس کے ساتھ گہرے مسائل سے دلچسپی اور فکری رُجحان بھی نظر آتا ہے جو اس عمر کے شاعروں میں عام طور سے بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے تجربات سے اس نے جو نتائج اخذ کیے ہیں انھیں اپنی شاعری میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ حیاتِ انسانی کی گہری صداقتوں کا اظہار ہو گئے ہیں۔ جدید شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ شاعری کے روایتی آداب اور سلیقے کے ساتھ نئے علوم اور آج کے انسان کی زندگی اور اس کی حقیقتوں سے نہ صرف واقف ہو بلکہ انھیں اپنے فن میں بیان بھی کرتا ہو۔ عنبر کے ہاں یہ رویہ نظر آتا ہے اور ایک سنجیدگی بھی ہے جسے دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اسی فنکارانہ خلوص سے کام کرتے ہوئے بڑی منزلیں سر کر سکتی ہے۔ (شہزاد احمد)

اک گل سے خوشبو کی رسم و راہ کافی ہے
لاکھ جبر موسم ہو یہ پناہ کافی ہے
نیت زلیخا کی کھوج میں رہے دُنیا
اپنی بے گناہی کو دل گواہ کافی ہے
عمر بھر کے سجدوں سے مل نہیں سکی جنت
خلد سے نکلنے کو اِک گناہ کافی ہے
آسماں پہ جا کے بیٹھے یہ خبر نہیں تم کو
عرش کے ہلانے کو ایک آہ کافی ہے
پیروی سے ممکن ہے کب رسائی منزل تک
نقش پا مٹانے کو گردِ راہ کافی ہے
چار دن کی ہستی میں نفس کے جی لیے عنبر
بے نشاط دُنیا سے یہ نباہ کافی ہے

دھیان میں آ کر بیٹھ گئے ہو تم بھی ناں
مجھے مسلسل دیکھ رہے ہو تم بھی ناں
ہر منظر میں اب ہم دونوں ہوتے ہیں
مجھ میں ایسے آن بسے ہو تم بھی ناں
دے جاتے ہو مجھ کو کتنے رنگ نئے
جیسے پہلی بار ملے ہو تم بھی ناں
عشق نے یوں دونوں کو ہم آمیز کیا
اب تو تم بھی کہہ دیتے ہو تم بھی ناں
خود ہی کہو اب کیسے سنور سکتی ہوں میں
آئینے میں تم ہوتے ہو، تم بھی ناں
بن کے ہنسی ان ہونٹوں پر بھی رہتے ہو
اشکوں میں بھی تم بہتے ہو، تم بھی ناں
کر جاتے ہو کوئی شرارت چپکے سے
چلو ہٹو تم بہت بُرے ہو، تم بھی ناں
میری بند آنکھیں بھی تم پڑھ لیتے ہو
مجھ کو اتنا جان چکے ہو، تم بھی ناں
مانگ رہے ہو رخصت مجھ سے اور خود ہی
ہاتھ میں ہاتھ لیے بیٹھے ہو، تم بھی ناں

کب موسمِ بہار پکارا نہیں کیا
ہم نے ترے بغیر گوارا نہیں کیا
دُنیا تو ہم سے ہاتھ ملانے کو آئی تھی
ہم نے ہی اعتبار دوبارا نہیں کیا
مل جائے خاک میں نہ کہیں، اس خیال سے
آنکھوں نے کوئی اشک ستارا نہیں کیا
اک عمر کے عذاب کا حاصل وہی بہشت
دو چار دن جہاں پہ گزارا نہیں کیا
اے آسمان کس لیے اس درجہ برہمی
ہم نے تو تیری سمت اشارا نہیں کیا
اب نفس کے تیرے ناز اُٹھائیں تو کس لیے
تو نے بھی تو لحاظ ہمارا نہیں کیا

شب تھی بے خواب اک آرزو دیر تک
شہرِ دل میں پھری کو بہ کو دیر تک
چاندنی سے تصور کا در وا ہوا
تم سے ہوتی رہی گفتگو دیر تک
جاگ اُٹھے تھے قربت کے موسم تمام
پھر بجی محفلِ رنگ و بو دیر تک
دفعتاً اُٹھ گئی ہیں نگاہیں مری
آج بیٹھے رہو رُو بہ رُو دیر تک
تم نے کس کیفیت میں مخاطب کیا
کیف دیتا رہا لفظ "تو" دیر تک
دل کے سادہ اُفق پر تھی سے رہے
رنگِ قوسِ قزح چار سو دیر تک
رَت جگے میں رہا خواب کا وہ سماں
کیفیت تھی وہی ہو بہ ہو دیر تک

الطاف صفدر

اپنی حالت دیکھ کر صفدر مجھے یاد اک مسجد پرانی آ گئی

الطاف صفدر نے غزل میں روایت کی پاسداری کی ہے مگر روایت کے حصار میں مقید رہنے سے گریز کیا ہے۔ وہ ان غزل گو شعرا میں شمار کیے جانے کے سزاوار ہیں جنھوں نے غزل کے تخلیقی عمل میں ذہنی اپج سے کام لیا لیکن کسی نوع کی بدعت فن کا ارتکاب کر کے شریعت غزل سے متصادم نہیں ہوئے۔ الطاف صفدر نے غزلیہ اسلوب اظہار میں میر تقی میر کے اداس لب ولہجہ کی تمنا کی ہے کہ اس لب ولہجہ سے غزل کا تغزل عبارت ہے۔ الطاف صفدر نے میر تقی میر سے متاثر ہونے کے باوصف انفرادی اسلوب، انفرادی زاویہ فکر اور متنوع شعری متن و مواد کی جمالیات سے اپنی غزل کو پرکشش بنانے کی سعی کی ہے۔

ہر ریگزار آرزو آوارگی آوارگی
دیر و حرم کی جستجو آوارگی آوارگی
محمل نہیں، لیلیٰ نہیں، مجنوں نہیں پھر دشت میں
ہے کیوں ابھی تک چار سو، آوارگی آوارگی
جلتے ہوئے اجسام کو درکار چادر برف کی
کوشش کا حاصل کو بہ کو آوارگی آوارگی
بھونرا ملامت کا ہدف تتلی کے سارے معترف
دونوں کی گرچہ ایک خو، آوارگی آوارگی
میں قید ہوں تا عمر اپنی ذات کے زندان میں
اب ہر طرف ہے تو ہی تو آوارگی آوارگی
صفدر ہے اس کے عہد کے دامن کی وسعت حشر تک
یعنی وفا کی گفتگو آوارگی آوارگی

نسیم یاد جو آنکھوں میں دل سے آتی ہے
اُداسیوں کے سمندر سمیٹ لاتی ہے
تمہارے ساتھ جو گزری وہ زندگی تھی مری
تمہارے بعد تو ہر روز موت آتی ہے
یہ کیسے اب کے گئے مجھ سے تم خفا ہو کر
خیال ساعت رخصت سے جان جاتی ہے
عجیب لوگ ہیں ہم بھی کہ اپنی خوش تھی
ہمیشہ ریت کے گھر گھاٹ پر بناتی ہے

ہے جس میں دیپ ترے انتظار کا روشن
وہ آنکھ اور کہاں جا کے لو لگاتی ہے
نہیں ہے کوئی مداوائے ہجر اے صفدر
دعائے صبر بھی اُلٹا اثر دکھاتی ہے

یاد جب اپنی کہانی آ گئی
خشک چشموں میں روانی آ گئی
حسن کی چڑھتی ندی کو دیکھ کر
موج میں میری جوانی آ گئی
میرا شہر دل جلا کچھ غم نہیں
اُس کو تو چنگیز خانی آ گئی
سوچ کے جب زخم گہرے ہو گئے
ذہن میں تب بے کرانی آ گئی
دھوپ اُتری اور پھر دریا چڑھے
برف گھل کر بن کے پانی آ گئی
اپنی حالت دیکھ کر صفدر مجھے
یاد اک مسجد پرانی آ گئی

ہر رات کی سحر ہے تو ہر دن کی شام ہے
دنیائے بے ثبات میں کس کو دوام ہے
ہر چیز کے لیے ہے فنا عشق کو بقا
وجہ وجود عشق علیہ السلام ہے

ممکن نہیں وہ آنکھ اُٹھے اور دل بچے
ابرو کی تیغ دم بہ دم بے نیام ہے
رنج و الم ہیں اصل میں معمار زندگی
ان کے بغیر خواہش تعمیر خام ہے
محرومیوں کو دیکھنا کیسا ملا وجود
منصب ہے خندہ پروری الطاف نام ہے

عشق کے راز ہائے سربستہ
چشم پرنم نے کر دیے افشا
تم کہو کیا بچائیں دامن دل
آتش غم سے گر ہو تن جلتا
دھوم تھی جس کی چارہ سازی کی
لا دوا اُس سے ایک درد ملا
بے وفائی کے زخم کا مرہم
دل نے جانا اک اور عہد وفا
نام الطاف، زندگی بے لطف
واہ رے تیری شان اے مولا

ساز بجتے ہیں تو رو دیتے ہیں
پھول کانٹا سا چبھو دیتے ہیں
جب بھی پاتا ہے کسی کو کوئی
پھر سے ہم آپ کو کھو دیتے ہیں

اشرف نقوی/شیخوپورہ

ہر ایک زمانے میں چلے جاتے تھے بے خوف   جب وقت ہوا کرتا تھا جاگیر ہماری

سید محمد اشرف نقوی جو کہ اشرف نقوی کے نام سے ادبی دُنیا میں اپنی پہچان رکھتے ہیں 6 مئی 1962ء کو شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔ ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ ''آخرش'' کے نام سے پہلا شعری مجموعہ 2006ء میں شائع ہوا۔ اشرف نقوی کی غزل جدید بھی ہے اور منفرد بھی۔ وہ اپنی غزل میں اُن موضوعات کو بھی شعریت عطا کرتے ہیں جو عموماً غزل کے نہیں ہوتے۔ کائنات اور زندگی سے متعلق ان کے اشعار نہایت فکر انگیز اور دل پذیر ہوتے ہیں۔ اُن کا کلام پاکستان کے معروف ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ غزل ان کی محبوب صنفِ سخن ہے اور وہ جدید غزل میں اپنا منفرد نام اور پہچان بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ (ارژنگ)

چھٹکے نہ اگر پاؤں میں زنجیر ہماری
لازم ہے بڑھے دار پہ توقیر ہماری
ہم خواب کے مجرم، کبھی تعبیر کے مجرم
تجویز کرے نیند ہی تعزیر ہماری
بیدارئ شب کا بھی ہمیں کوئی صلہ دے
تقدیر بنا نالۂ شب گیر ہماری
ہر ایک زمانے میں چلے جاتے تھے بے خوف
جب وقت ہوا کرتا تھا جاگیر ہماری

سوکھے ہوئے دریا کی نشانی کے علاوہ
سب کچھ ہے مری آنکھ میں پانی کے علاوہ
آیا ہوں بھرے شہر سے اک دشت کی جانب
اک ہجر لیے نقل مکانی کے علاوہ
چوپال میں اے دیر سے بیٹھے ہوئے لوگو
کیا تم کو سناؤں میں کہانی کے علاوہ
کرنی ہے لہو سے مجھے آرائشِ مقتل
اور میرا لہو کچھ نہیں پانی کے علاوہ
تاثیر نہیں لہجے میں میرے کہ زباں میں
لکنت بھی ہے آزردہ بیانی کے علاوہ
دریا ہوں سو بہتا ہی چلا جاؤں گا اشرف
سیکھا نہیں کچھ میں نے روانی کے علاوہ

مری دُعا میں کچھ ایسا اثر نکل آیا
جو سوکھا پیڑ تھا، اس پر ثمر نکل آیا
ملی ہوئی ہے ہمیں چادرِ معیشت وہ
کہ پاؤں ڈھانپ لیے ہیں تو سر نکل آیا
نکل تو آیا ہوں آفاق سے کہیں آگے
یہ کس خیال میں کھو کر کہاں نکل آیا
میں دیکھتا تھا جسے شام کے کنارے پہ
وہ چاند آج مرے بام پر نکل آیا
خزاں پرست بھی پھولوں کی بات کرتے ہیں
منافقت میں یہ کیسا ہنر نکل آیا
بچے گا کچھ نہ یہاں پر سوا اندھیرے کے
میں اک چراغ کی لو سے بھی گر نکل آیا

خواہشِ وصل کو صورت وہ عطا کر دی ہے
ہجر پائندہ رہے، ہم نے دعا کر دی ہے
آئینہ خانے پہ چڑھ دوڑے ہو پتھر لے کر
آئینوں نے کہو کیا ایسی خطا کر دی ہے
خاک زادہ ہوں، سو قسمت نے گواہی میری
ایک عالم میں مری خاک اُڑا کر دی ہے
دشت لکھتا ہوں تو دریا ہی لکھا جاتا ہے
پیاس نے مجھ میں وہ ہلچل سی بپا کر دی ہے
فاصلہ دل کا تھا دہلیز سے دو چار قدم
میں نے رستے میں مگر عمر فنا کر دی ہے
رات کیا میں نے درِ خواب پہ دستک دے دی
ہائے آنکھوں نے مری نیند قضا کر دی ہے
ماورا ہونے لگا جسم کی حد سے اشرف
جس نے اُس ذات میں گم اپنی انا کر دی ہے

اک خواب گھر میں خواب سجا کر میں سو گیا
جب نیند آئی، جسم بچھا کر میں سو گیا
باہر بدن سے تھا تو بہت جاگتا تھا میں
آتا ہوا بدن میں تو آ کر میں سو گیا
دریا بڑھا تھا میری طرف طمطراق سے
اک دشت تھا، سو پیاس بجھا کر میں سو گیا

اسد بیگ/راولپنڈی

ترے وجود کی کافی ہے اک کتاب مجھے — زمانے بھر کا بھلا میں نصاب کیا کرتا

اسد بیگ جواں فکر اور تازہ جذبوں کے شاعر ہیں۔ اُن کی غزل جدت اور تازگی کا احساس لیے ہوئے ہے۔ وہ عموماً چھوٹی بحر میں غزلیں کہتے ہیں مگر یہ غزلیں نہایت شگفتہ اور دل پذیر ہوتی ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں اپنے محبوب اور مناظر فطرت سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ وہ تراکیب یا مشکل الفاظ کے ذریعے قاری پر اپنی علمیت کا رعب نہیں جھاڑتے بلکہ سادگی سے اپنے اندر کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے طبیعت بوجھل ہونے کی بجائے تر و تازہ ہو جاتی ہے۔

شب وصال کا کوئی حساب کیا کرتا
تمہارے بعد میں آنکھوں میں خواب کیا کرتا
ملا نہ تو تو کسی پر نظر نہیں ٹھہری
حصار جاں میں سلگتا شباب کیا کرتا
ترے وجود کی کافی ہے اک کتاب مجھے
زمانے بھر کا بھلا میں نصاب کیا کرتا
نشہ سوا ہے ترے ہجر کے فسانے کا
خرد رہے کہ جنوں انتخاب کیا کرتا
ترے جمال سے روشن اسد یہ منظر ہیں
پڑا تھا رُخ پہ وگرنہ نقاب کیا کرتا

عشق کا جو نصاب ہوتا ہے
زندگی کا حساب ہوتا ہے
خوشبوؤں کے پیام آتے ہیں
جب نظر میں گلاب ہوتا ہے
پس منظر چھپی ہے سچائی
سامنے کب سراب ہوتا ہے
وصل کی داستاں کے آخر میں
اک جدائی کا باب ہوتا ہے
آنکھ ہوتی ہے بے قرار جتنی
اُتنا بے چین خواب ہوتا ہے
اک سوال رُخ تمنا کا
کتنا مشکل جواب ہوتا ہے

یاد ہیں مجھ کو شام کی باتیں
وصل کے قصے جام کی باتیں
پیار کی راہ پہ چلنے والے
سوچیں کب انجام کی باتیں
کس نے چھیڑیں اس محفل میں
آ کر خاص و عام کی باتیں
کیسا وہ صیاد ہے یارو
کرتا نہیں جو دام کی باتیں
اس بستی سے نکلو یارو
رہنے دو بسرام کی باتیں
بازاروں میں رہنے والے
کب کرتے ہیں رام کی باتیں
تیرے وصل میں پگلا منوا
بھول گیا سب کام کی باتیں

خواب گم ہو گئے آنکھ لگتی نہیں
تم کہاں کھو گئے آنکھ لگتی نہیں
سر زمین محبت ہے دکھی ہوئی
درد کیا بو گئے آنکھ لگتی نہیں
تیری چاہت کا کیسا کرشمہ ہے یہ
رتجگے سو گئے آنکھ لگتی نہیں
زخم تھے رات دل کو دکھاتے رہے
داغ تھے دھو گئے آنکھ لگتی نہیں
خواہشوں کے جہاں، حسرتوں کے کنول
بے وفا ہو گئے آنکھ لگتی نہیں
ایک جیون تھا بوجھل سفر در سفر
بوجھ تھا ڈھو گئے آنکھ لگتی نہیں
پھر کسی کی ہیں یادیں نظر در نظر
پھر کے رو گئے آنکھ لگتی نہیں
وہ مناظر اسد جن سے تھی زندگی
آنکھ سے کھو گئے آنکھ لگتی نہیں

فرزانہ جاناں/اسلام آباد

دیوانگی مری تو مجھے مار دے گی پر — کیسے نکل سکیں گے ستم گر کے جال سے

فرزانہ جاناں ممتاز شاعرہ اور کہکشاں انٹرنیشنل کی مدیرہ (اعزازی) ہیں۔ فرزانہ جاناں کی شاعری ہمارے عہد کی عورت کی شاعری ہے جس میں اس کے مسائل، دُکھ، خوشیاں اور جذبات بکھرے ہوئے ہیں۔ فرزانہ جاناں کی شاعری میں ہمیں زندگی کے مختلف شیڈز ملتے ہیں۔ اگرچہ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع تو محبت ہے جو کہ ہر دور کی شاعری کا بڑا موضوع رہا ہے۔ مگر اس سے باہر نکل کر بھی انھوں نے شاعری کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ چونکانے والے مصرعے اور اشعار کہنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔

پس منظر میں رہ کر جی رہی ہوں
کسی پیکر میں رہ کر جی رہی ہوں
دیا جلتا ہے دل میں روز ہی اک
کسی مندر میں رہ کر جی رہی ہوں
ہے دل اس کا تو ہیرے کی طرح سے
یہ کس پتھر میں رہ کر جی رہی ہوں
یہاں کٹنے لگے ہیں پیڑ تک بھی
میں اُجڑے گھر میں رہ کر جی رہی ہوں
ہوں جاناں بھولی سی اِک داستاں میں
جو چشمِ تر میں رہ کر جی رہی ہوں

دل لگ گیا کسی کے جو حسن و جمال سے
تھے اور ہی طرح کے نئے خد و خال سے
دیوانگی مری تو مجھے مار دے گی پر
کیسے نکل سکیں گے ستم گر کے جال سے
کیوں دسترس میں آ کے بھی میرا نہیں ہوا
کچھ بھی عیاں نہیں ہے صنم تیری چال سے
ہوتا ہے ہم کلام وہ شام و سحر مگر
آنکھوں میں لگ رہے تھے نئے کچھ سوال سے
جاناں تو اس کی ذات میں کیسے سما گئی
پوچھیں گے ایک دن یہ اسی باکمال سے

غبارِ عکس کو طاقِ گماں سے دیکھیں گے
سکوتِ عکس کو اب ہم کہاں سے دیکھیں گے
بدن کے زاویے ہیں آئنے میں آویزاں
جہاں ہوتا نہیں ممکن وہاں سے دیکھیں گے
سفر میرا رواں ہے خاکِ صلصال ابھی تک
کنارِ جاں، کنارِ بیکراں سے دیکھیں گے
سمندر میں بچھا ہے جال تیری نظروں کا
فروغِ عشق تو اب لامکاں سے دیکھیں گے
یہ کس کا ہے لہو پھیلا فصیلِ شوق یہاں
لہو کا رنگ اب ہم آسماں سے دیکھیں گے

تھا عالمِ تحیر ہمیں در نہیں ملے
وہم و گماں میں بھی کوئی گھر نہیں ملے
یادوں کا اک دریچہ مری ذات بن گئی
خوشبو تھی ہم رکاب یہ منظر نہیں ملے
اب کے غبارِ شب میں ملاقات ہو تو ہو
جن کی تلاش تھی وہ ستم گر نہیں ملے
پاؤں میں تھی مرے تو وہ زنجیرِ درد کی
بہہ جائیں جس میں غم وہ سمندر نہیں ملے
جسموں کا اک بہاؤ تھا بحرِ حیات میں
کنکر تھے راستے میں جواہر نہیں ملے

اُلجھی ہوئی تھی چاک پہ نادیدہ ہاتھ سے
جو چاہتی تھی میں وہ مقدر نہیں ملے
قیدِ حیات کاٹ لی ہم نے یہ کس طرح
جاناں وہ ہم کو زنداں میں آ کر نہیں ملے

آنکھوں میں بسا لینا خوابوں کو ذرا تم بھی
ہونٹوں پہ سجا لینا لفظوں کو ذرا تم بھی
ہم کو تو جہاں میں بھی زنجیر نے جکڑا ہے
یہ بات بتا دینا زخموں کو ذرا تم بھی
اب رسمِ وفا کو تا دنیا سے مٹا دینا
خود مٹ کے دکھا دینا اوروں کو ذرا تم بھی
کیوں آگ سی بھڑکی ہے میرے ہی مکاں میں اب
جلدی سے بجھا دو ان شعلوں کو ذرا تم بھی
وہ دوست تو اپنا ہے لگتا ہے پرایا کیوں
اِک بار سلا دینا یادوں کو ذرا تم بھی
میں اس کو ملوں جاناں قسمت میں کہاں لکھا
اِک بار بھلا دینا رسموں کو ذرا تم بھی

ضیغم عدیل کاظمی

میرا دلربا، تو ہے باوفا تو ہے ناخدا — تیرے بارے میں یہ گمان تھے کسی دور میں

سید ضیغم عدیل کاظمی کا تعلق بستی چاہ روشن ڈیرہ اسماعیل خاں سے ہے۔ ابتدائی تعلیم ڈیرہ اسماعیل خاں سے حاصل کی۔ ایم۔ اے ماس کمیونیکیشن میں گومل یونیورسٹی سے کیا۔ اردو اور سرائیکی میں شاعری کرتے ہیں۔ پسندیدہ صنف غزل ہے۔ شاعری میں شہاب صفدر کو اپنا استاد مانتے ہیں۔ مختلف آل پاکستان اور آل پنجاب کالج لیول کے مشاعروں میں پوزیشن حاصل کرتے رہے ہیں۔ غزل پسندیدہ صنف ہے۔ شاعری میں مولانا روم، حافظ شیرازی، شیخ سعدی، علامہ اقبال، ناصر کاظمی، احمد فراز اور شہاب صفدر سے متاثر ہیں۔

خود اپنی موج غم میں غرقاب ہے سمندر
مہتاب کے لیے کیوں بے تاب ہے سمندر
سجدے میں غوطہ زن ہوں موجوں کے گنبدوں میں
بنتا کہیں بھنور سے محراب ہے سمندر
تنہائیوں کا بستر، اُمید کا ہے تکیہ
تعبیر ہے کنارا، اِک خواب ہے سمندر
دراصل کچھ نہیں ہوں دراصل ہوں جو کچھ ہوں
اصل سراب کیا ہے بے آب ہے سمندر
کج عصا کے حامل موسیٰ کا لشکری ہوں
میری کتاب دل کا ہر باب ہے سمندر
چوتھائی خشکیوں پر طغیانیوں کا موسم
بند شعور باندھو، خوناب ہے سمندر
ذی عقل جس کا مسکن، تالاب، اس کے نزدیک
تالاب ہی ہے دریا، تالاب ہے سمندر

وہ جو ماورائے بیاں تھے کسی دور میں
وہ سخن نگہ کی زباں تھے کسی دور میں
کسی دور میں ہو گئے تم بھی ان کی طرح نحیف
یہ ضعیف تم سے جوان تھے کسی دور میں
میرا دلربا، تو ہے باوفا، تو ہے ناخدا
تیرے بارے میں یہ گمان تھے کسی دور میں

جو ستارے صبح طرب کی سانس میں ڈھل گئے
شب غم کی روح رواں تھے کسی دور میں
وہی چشم ولب مری وجہ مرگ بنے ہیں آج
وہی چشم ولب مری جان تھے کسی دور میں
وہی لوگ مخلص و باوفا جو نہیں رہے
وہی تو بتائے جہان تھے کسی دور میں

روئے مہتابی کی سمت ارمان سے اُٹھنے لگے
دل میں بے تابی سے کچھ طوفان سے اُٹھنے لگے
اور جھکنے والے کیسے خاک میں مل بھی گئے
اور کٹنے والے سرکس شان سے اُٹھنے لگے
پھر وہی واجب کی لامحدودیت میں کھو گئے
وہ جو اندیشے حد امکان سے اُٹھنے لگے
پھر تو آیا اور خوشیاں آ بسیں اس شہر میں
غم کے باشندے دیارِ جان سے اُٹھنے لگے
ورنہ اتنی سودمندی تیری قسمت میں کہاں
فائدے تیرے مرے نقصان سے اُٹھنے لگے
اور آہوں کا دھواں چھانے لگا خیموں کے پاس
اور شعلے خون کے میدان سے اُٹھنے لگے
سرزمین فکر پر الہام کی بارش ہوئی
ابر ہائے آگہی وجدان سے اُٹھنے لگے
جانے کیوں اک آشنا سی ذات کی خاطر عدیلؔ
دل میں اتنے واہمے انجان سے اُٹھنے لگے

فلک پر اس زمیں کے سب نظارے تیرتے دیکھے
نظر لوٹی تو پانی میں ستارے تیرتے دیکھے
کسی بھی تیرنے والے نے اک اُس کو نہیں دیکھا
مگر اک ڈوبنے والے نے سارے تیرتے دیکھے
تو جن کی بات کرتا ہے کہ بن میں کٹ گئے پیاسے
وہ سر تو میں نے دریا کے کنارے تیرتے دیکھے
کنارے سے سمندر بھی ہمیں ساکن نظر آیا
بھنور میں جا کے دیکھا تو کنارے تیرتے دیکھے
خدا نے چاہا تو پانی میں رستے بن گئے ضیغم
خدا نے جب دکھایا تو کنارے تیرتے دیکھے

ابر گماں جھوٹا تو ہے
اک آس کا بوٹا تو ہے
میرے صنم تیرا ستم
مجھ پر سہی، ٹوٹا تو ہے
کب آنکھ پتھرائی مری
چشمہ ابھی پھوٹا تو ہے

اعجاز دانش/میلسی

مجھے خبر ہے وہ کچا ہے عہد و پیاں کا   وہ اپنے قول سے لیکن مکر کے روئے گا

اعجاز حسین کی جنم بھومی خیان گڑھ ضلع مظفر گڑھ ہے۔ ادبی نام اعجاز دانش ہے۔ ابتدائی تعلیم مظفر گڑھ سے حاصل کی۔ تلاشِ معاش میں میلسی کو اپنا مسکن بنایا۔ گزشتہ دس سال سے شعرو ادب سے وابستہ ہیں۔ مختلف اخبارات ورسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ ماسٹر یونیورسل سکول سسٹم میلسی سے وابستہ ہیں۔ نامور شاعر خورشید بیگ میلسوی کو شاعری میں اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں۔ "دشت عشق" کے نام سے ان کا مجموعہ کلام زیر طبع ہے

تجھے بھی ایک دن دلگیر کر کے چھوڑوں گا
میں تیرے ذہن کو تسخیر کر کے چھوڑوں گا
بلا سے ٹوٹ ہی جائے مرا قلم لیکن
میں اپنی داستاں تحریر کر کے چھوڑوں گا
رقم کروں گا ترے خدوخال کاغذ پر
خیال وخواب کو تصویر کر کے چھوڑوں گا
رہِ ادب کا مسافر ہوں اور یقیں ہے مجھے
جہانِ فکر کو جاگیر کر کے چھوڑوں گا
مرے حصار سے باہر رہے گا تو کب تک
میں تیری سوچ کو زنجیر کر کے چھوڑوں گا
میں اپنی فکر سے قائل کروں گا محفل کو
سخن کو حاصلِ تدبیر کر کے چھوڑوں گا
مجھے بھی اُس نے ستایا ہے عمر بھر دانش
سو دل کو ایک دن تخچیر کر کے چھوڑوں گا

میں جانتا تھا کبھی یاد کر کے روئے گا
وہ ایک روز مجھے آنکھ بھر کے روئے گا
وہ دل کا حال چھپائے گا کیسے چہرے سے
وہ آئینے کے مقابل سنور کے روئے گا
زمیں نژاد کو اس کی خبر نہ تھی معلوم
وہ آسمان سے نیچے اُتر کے روئے گا
سنا ہے فصلِ چمن اب کے خوف بوئے گی
گلاب موسمِ گل میں نکھر کے روئے گا
اُسے ضمیر ملامت کرے گا بالآخر
وہ مجھ پہ دیکھنا الزام دھر کے روئے گا
مجھے خبر ہے وہ کچا ہے عہد و پیاں کا
وہ اپنے قول سے لیکن مکر کے روئے گا
وہ بے خبر ہے ابھی خار زارِ اُلفت سے
وہ دشتِ عشق سے دانش گزر کے روئے گا

ضبطِ تحریر میں لاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
غم کی تفسیر سناتے ہوئے ڈر لگتا ہے
میں ترے عیب و ہنر کا ہوں شناسا لیکن
آئینہ تجھ کو دکھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
اس طرح خوف نے زنجیر کیا ہے مجھ کو
کہیں جاتے کہیں آتے ہوئے ڈر لگتا ہے
جب سے ٹوٹا ہے مرے ضبط کا بندھن مجھ سے
اشک آنکھوں میں چھپاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
یوں نہ ہو تجھ کو کہیں میری نظر لگ جائے
تیری تصویر بناتے ہوئے ڈر لگتا ہے
اس قدر عشق نے بدنام کیا ہے مجھ کو
ربط دل اُس سے بڑھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
بدگمانی کا یہ عالم ہے کہ اب تو دانش
دل کی ہر بات بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

تیرا لہجہ بدل نہیں سکتا
تو محبت میں ڈھل نہیں سکتا
تیز گامی ہے مسئلہ تیرا
میں ترے ساتھ چل نہیں سکتا
منہ کے بل جو زمیں پہ گر جائے
پھر وہ گر کر سنبھل نہیں سکتا
لکھنے والے نے لکھ دیا جو بھی
اب مقدر بدل نہیں سکتا
جس کی بنیاد زخم خوردہ ہو
وہ شجر پھول پھل نہیں سکتا
آتشِ ہجر میں کوئی عاشق
مثلِ پروانہ جل نہیں سکتا
اُس کو جذبوں کی قدر کیا دانش
سنگِ خارا پگھل نہیں سکتا

اسماء سحر / مردان

شب کٹھن تھی نہ کوئی چاند ہی ہمراہ تھا   اک ستارہ بام پر لیکن ضیاء دیتا رہا

اسما سحر میں غیر معمولی فطری اور تخلیقی صفات پائی جاتی ہیں۔ پہلا وصف تو یہ کہ وہ طبع موزوں سے آراستہ ہے۔ دوسرے وہ حیرت انگیز طور پر اُردو کے لسانی کلچر کو اپنی سائیکی میں جذب کر چکی ہے۔ اس دور میں جب نئی نسل بہ وجوہ اُردو سے دور ہوتی جا رہی ہے اسما سحر کو الفاظ کی صحت کا خیال اپنی صحت سے بھی زیادہ رہتا ہے۔ حق، تلفظ الفاظ کا دروبست اس میں کہیں بھی اجنبیت اور "غرابت" نہیں آنے پاتی۔ اس نے جو کچھ بھی کہا ہے اپنے انفرادی انداز میں کہا ہے۔ وہ بحرِ سخن میں غواصی کر کے اپنی پسند اور اپنے مزاج کے لعل و گہر ڈھونڈ لاتی ہے۔ (پروفیسر سحر انصاری)

بکھرے بکھرے خواب

اُلجھے اُلجھے زیست کے رستے بکھرے بکھرے خواب
رات سے لپٹی ایک اُداسی، جلتا ہے مہتاب
خوشبو خوشبو اس کی سانسیں کومل سا احساس
جاگ رہے ہیں یاد کو اوڑھے سپنے ہیں بے تاب
چندا جھانکے چوری چوری اور تارے مسکائیں
جاگی آنکھوں سے جب دیکھوں ساجن تیرے خواب
ہم سا کوئی ہو جو ویراں منظر دکھتا ہو
چہرے پر طوفان کے سائے آنکھوں میں سیلاب
تیری یاد سے جیون مہکے اور یہ دل بہلے
تیری یاد سکوں کا باعث تیری یاد عذاب

محبتوں کا نہیں کوئی آسرا مجھ کو

محبتوں کا نہیں کوئی آسرا مجھ کو
نہیں ہے کوئی شکایت کوئی گلہ مجھ کو
کسی تلاش میں کب تک پھروں گی خاک بہ سر
تھکن سے چور ہوں منزل کا دے پتہ مجھ کو
مرے وجود برہنہ پہ شالِ غم ڈالی
یہ زندگی نے دیا ہے عجب صلہ مجھ کو
میں بے نشان ہوں کوئی مجھے نشاں دے دے
برنگِ حرفِ غلط یوں نہیں مٹا مجھ کو
کسی بھی غم کو نہیں کیوں ثبات اے مولیٰ
ہر ایک بار نیا غم ہی کیوں ملا مجھ کو؟
سکوں جو میرے مقدر میں اب نہیں ہے سحر
دے بے سکونی بھی بے حد مرے خدا مجھ کو

جب محبت اُسے ہوئی ہوگی

جب محبت اُسے ہوئی ہوگی
کتنی وحشت اُسے ہوئی ہوگی
چاند تاروں سے آج ہجر کی رات
اک شکایت اُسے ہوئی ہوگی
میری نظروں سے دیکھ کر خود کو
کتنی اُلفت اُسے ہوئی ہوگی
پھر کوئی زخم دینے آیا ہے
کچھ تو زحمت اُسے ہوئی ہوگی
رو دیا ہوگا ہجر راتوں میں
جب اذیت اُسے ہوئی ہوگی

تنہائی کا دُکھ گہرا تھا

تنہائی کا دُکھ گہرا تھا
زرد بہاروں کا چہرہ تھا
جیون کے ہر اک رستے پر
تیری یادوں کا پہرہ تھا
کتنی منت کی رُک جائے
وصل کا ہر لمحہ بہرہ تھا
چار دیواری میں اس دل کی
غم کا آسیب آ ٹھہرا تھا
پیاس سمندر کی جیسی تھی
پیروں سے لپٹا صحرا تھا

زندگی جینے کا مجھ کو حوصلہ دیتا رہا

زندگی جینے کا مجھ کو حوصلہ دیتا رہا
کیا وہ مجھ کو اک انوکھی بددعا دیتا رہا؟
قتل تھا جس کا ہوا بس اک ادھورا خواب تھا
اور ساری زندگی وہ خوں بہا دیتا رہا
سازشیں ایسی ہوئیں گھر چھوڑ کر جانا پڑا
اور اس کے بعد وہ کیسی صدا دیتا رہا
شب کٹھن تھی، نہ کوئی چاند ہی ہمراہ تھا
اک ستارہ بام پر لیکن ضیا دیتا رہا
خواہشوں کی بھیڑ میں وہ شخص ایسا کھو گیا
وصل کا لمحہ سحر اُس کو صدا دیتا رہا

متفرق شاعری

تصویر کائنات میں کم دلکشی رہی
تیری کمی رہی کہیں میری کمی رہی
جب تک ترے خیال سے وابستگی رہی
اپنی مثال آپ مری شاعری رہی
اک رات خواب میں وہ ملے تھے پھر اس کے بعد
بزمِ خیالِ یار کئی دن سجی رہی
پھولوں کی انجمن میں ستاروں کی بھیڑ میں
میری نگاہِ شوق تمہیں ڈھونڈتی رہی
آسان ہو گیا ہے ہر اک جادۂ حیات
لیکن رہِ وفا کی اذیت وہی رہی
اس رشکِ ماہتاب کے جانے کے بعد بھی
کمرے میں رات دیر تلک روشنی رہی
حیرت ہے میں بھی سچ کی گواہی نہ دے سکا
مجھ کو بھی آئینے کی طرح چپ لگی رہی
کہنا ہی میرے بس میں تھا سو میں نے کہہ دیا
اب پھر بھی ملیں گے اگر زندگی رہی
نصرتؔ خیالِ یار سے جی کا زیاں ہوا
لیکن مرے مزاج میں آسودگی رہی

نصرت صدیقی/فیصل آباد

بلبلوں کی جانے کیوں ہم جولیاں آتی نہیں
اب چمن میں تتلیوں کی ٹولیاں آتی نہیں
ہو رہی ہیں شادیاں اب خاندانوں میں عجب
لوٹ آتی ہیں براتیں ڈولیاں آتی نہیں
جب لہو کے رنگ سے پچکاریاں ماریں نہ لوگ
کب گلی کوچوں میں ایسی ہولیاں آتی نہیں
دیکھنا یہ ہے کہاں دشمن کی بندوقیں نہیں
کس طرف سے میرے گھر میں گولیاں آتی نہیں
جتنی باتیں سوچتے ہیں دل ہی دل میں سوچ لیں
ہم کو باتیں آپ سے منہ بولیاں آتی نہیں
کیسے سمجھیں جنگلوں میں کس کی دنیا لٹ گئی
ہم کو ثاقبؔ پنچھیوں کی بولیاں آتی نہیں

آصف ثاقب/ایبٹ آباد

ظلم حالات کا حد سے بھی سوا ہو جیسے
زندگی ایسے خفا ہے کہ سزا ہو جیسے
ہو گیا تیرا رویہ بھی زمانے کی طرح
تو بھی یوں لگتا ہے کچھ بدلا ہوا ہو جیسے
ہم نے ہر حال میں روشن ہی رکھا دل کا دیا
اس میں اکثر یہ ہوا دل ہی جلا ہو جیسے
یوں بچا لیتی ہیں یہ ماں کی دعائیں اکثر
ماں کا پیکر ہی حقیقت میں خدا ہو جیسے
آج بھی گزرے ہوئے لمحے تصور میں ہیں
"تم مرے ہو" یہ ابھی تم نے کہا ہو جیسے
مجھ سے مت پوچھ کہ تھی کتنی وفا کی امید
تو مگر عہد وفا بھول چکا ہو جیسے
یوں دھڑکتا ہے مرے دل میں تمہارا دل بھی
ہو تمہارا ہی مرا دل نہ مرا ہو جیسے
وہ نظر ملتے ہی نظروں کو جھکا لیتے ہیں
خانۂ دل میں کوئی راز چھپا ہو جیسے
فاختہ پنجرے میں بے جان پڑی ہے زیبیؔ
زیست کی قید سے اک روح رہا ہو جیسے

زیب النساء زیبیؔ

میں مانگتی ہوں اسی کو رب سے
کوئی تو ہے جو مجھے ہی میری طرح سے تکتا ہے
شب گزرتے
ہاں دن نکلتے
یہ کون ہے جو ہوائے تازہ کا نم سا جھونکا بنا ہوا ہے
یہ کون ہے جو مشامِ جاں میں اتر کے مجھ کو
صدائیں دیتا ہے چپکے چپکے
یہ کون ہے جو مجھے بلاتا ہے خوشبوؤں کی طرح مسلسل
یہ کون ہے جو میرے بدن میں سما چکا ہے
مجھے سمندر بنا چکا ہے
میں منتظر ہوں اس کی کب سے
میں مانگتی ہوں اسی کو رب سے

عابد سیال/سویڈن

کب جیب غیب، وقت کے داماں پہ اپنا بس
چلتا ہے صرف اپنے گریباں پہ اپنا بس
بین السطور حرف و حکایت کی چھوٹ ہے
انجام پر نہ مقصد و عنواں پہ اپنا بس
کیا روک پائے کوئی گھٹا کو برسنے سے
ممکن کہاں طبیعتِ گریاں پہ اپنا بس
ناچار اٹھا رہے ہیں حفاظت سے تیری ہاتھ
اے زندگی نہیں غم و حرماں پہ اپنا بس
آ جائے بس میں پھر کہیں مشکل نہیں مگر
مشکل ہے بس طریقۂ آساں پہ اپنا بس
پلڑا جھکا تو سب تہ و بالا ہے الغرض
میزاں کے اختیار سے ایواں پہ اپنا بس

آگے شہاب کاتبِ تاریخ جو لکھے
قصہ ہے باب مقتل و زنداں پہ اپنا بس

شہاب صفدر/راولپنڈی

میں خوبیوں کا حوالہ نہ خامیوں سے پرے
مگر میں زندہ رہوں گا غلامیوں سے پرے
اُتر گیا ہے مرا کارواں سر صحرا
خیام نصب کروں گا میں شامیوں سے پرے
دیارِ شوق میں رہتے ہیں ہم وجاہت سے
مصیبتوں سے پرے بدکلامیوں سے پرے
قیام کرنا پڑا ہے مجھے بھی غربت میں
مخالفوں کے بھروسے پہ حامیوں سے پرے
شعور ذات میں مختار ہے یہ شہزادہ
گزر رہا ہے بھی کی سلامیوں سے پرے
چلے گئے تو چلے آئیں گے اکیلے میں
ہمیں حسینوں سے ملنا ہے حامیوں سے پرے
کسی کی ایک اشارے پہ مر گئے ہیں اسد
زمانہ جانتا ہے نیک نامیوں سے پرے

اسد اعوان/سرگودھا

میری دعاؤں میں بھی اثر ہونا چاہیے
سرسبز ہو شجر تو ثمر ہونا چاہیے
مجھ کو یہ کائنات نہیں اس طرح قبول
اب کچھ نہ کچھ اِدھر سے اُدھر ہونا چاہیے
روتی نہیں ہے آنکھ تو ہوتی نہیں ہے آنکھ
گر آنکھ ہے تو آنکھ کو تر ہونا چاہیے
خستہ کواڑ پردہ پرانا ضرور ہے
جیسا بھی ہو مکان میں در ہونا چاہیے
ہے کارِ عشق ایک ہمہ وقت مشغلہ
یہ کارِ عشق زندگی بھر ہونا چاہیے
اپنی بلا سے دیکھنے والا کوئی نہ ہو
اپنے لیے تو اہلِ نظر ہونا چاہیے
صحرا کے اس سفر میں مسافر کے واسطے
رستے میں سایہ دار شجر ہونا چاہیے
اے ربِ کائنات! اتری خاک دان میں
خرم سا کوئی خاک بسر ہونا چاہیے

خرم جمیل/ایلسی

غموں کی دھوپ میں اک سائبان ہے میرا
میں اک زمین ہوں تو آسمان ہے میرا
یہیں کہیں سے ابھی کوئی تیر آئے گا
یہیں کہیں پہ کوئی مہربان ہے میرا
اُتر چکا ہے ترا ہجر میری رگ رگ میں
وصالِ یار یہ دکھ جاودان ہے میرا
اُسے کہو کہ میں رہتا ہوں دھیان میں اُس کے
اُسے کہو کہ مکاں بے نشان ہے میرا
میں تیرے نام کا رکھتا ہوں طوق سینے پر
اسی لیے تو جہاں قدردان ہے میرا
جواز زندگی تیرے سوا نہیں کچھ بھی
مرا غرور ہے اور تو ہی مان ہے میرا
ترے اشارے پہ چلتی ہے جسم کی کشتی
ترا دوپٹہ ہے یا بادبان ہے میرا

ساحل سلہری/سیالکوٹ

لوگ کہتے ہیں بہت غم خوار رہتے تھے یہاں
میں یہ کہتا ہوں مرے اغیار رہتے تھے یہاں
چاند سورج رات دن بارش زمیں بادل فلک
ان سے بڑھ کے بھی بہت کردار رہتے تھے یہاں
اب جہاں دیکھو نظر آتے ہیں مے خانے وہاں
شہر میں بس عشق کے بیمار رہتے تھے یہاں
کچھ تو ایسے جن کی کوئی شکل بھی ملتی نہ تھی
کچھ مرے جیسے بہت بے کار رہتے تھے یہاں
کس گلی میں اب ہیں جانے ان کی جلوہ ریزیاں
میں کہاں تھا جب مرے سرکار رہتے تھے یہاں
کاغذی کشتی سمندر کے کنارے دیکھ کر
یوں لگا خرم کہ میرے یار رہتے تھے یہاں

خرم شہزاد خرم

جیسے یہ دل کا داغ جلتا ہے
آئنے میں چراغ جلتا ہے
ان سنہری لبوں کی حدت سے
ارغوانی ایاغ جلتا ہے
اس زمین و زماں کے بارے میں
سوچنے تو دماغ جلتا ہے
اس قدر تیز آگ ہے مجھ میں
سانس لینے سے باغ جلتا ہے
شعلہ سبز میں تمہارے لیے
روشنی کا سراغ جلتا ہے
لومڑی، لومڑی کی دشمن ہے
اور شاہیں سے زاغ جلتا ہے

سید کامی شاہ/کراچی

بے حد قدیم دریا ہے
یہ جو میرے لہو میں بہتا ہے

میں اُسے پڑھ رہا ہوں صدیوں سے
اک ستارہ مرا صحیفہ ہے
میں نے اس پھول کی قسم کھائی
رنگ جس کا تمہارے جیسا ہے
جھلمیں آسمان ہاتھوں سے
موسم گل تمہارا چہرہ ہے
آنکھ بس تم کو دیکھتی ہے یہاں
دل تمہارے لیے دھڑکتا ہے
دو سنہری قدیم روحیں ہیں
اور جادو ہمارا بیتا ہے
یہ جو وحشت ہے عشق کی وحشت
اس کے آگے تو قیس بچہ ہے
خود سے آگے نکلنے کی خاطر
آدمی تیز تیز چلتا ہے
دو شگفتہ حسین پھولوں میں
ایک ہنستا ہوا پیالہ ہے
یہ ترے باغ دیکھنے کے لیے
مجھ کو واپس پلٹ کے آنا ہے

سید کامی شاہ/کراچی

اگر ہو دل میں تیری یاد تو دل کی دوا کیا ہو
چھلک جائیں اگر آنکھیں تو آنکھوں کی سزا کیا ہو
زہے قسمت وہ میرے گھر میں مجھ سے ملنے آئے ہیں
اس عالم میں بھلا ہونٹوں پہ حرفِ مدعا کیا ہو
ادھر تو ابتدائے عشق میں ہے جاں بلب اپنی
خدا جانے جنونِ شوق کی اب انتہا کیا ہو
انہی کی آرزو دل میں زباں پہ تذکرہ ان کا
اگر یہ بے وفائی ہے تو پھر کہہ دو وفا کیا ہو
فقط اک جنبشِ لب پہ لٹا ڈالا ہے تن من دھن
تبسم کی بھلا ہم سے سحر قیمت ادا کیا ہو

سحر سرفراز بودلہ/اوکاڑہ

سامنا جب جناب ہوتا ہے
کیوں یہ حائل حجاب ہوتا ہے
عشق ہوتا نہیں ہے اول تو
جب بھی ہو بے حساب ہوتا ہے
کیا کسی نے نہیں بتایا تمہیں
مسکرانا ثواب ہوتا ہے
اس لیے سہتا ہوں ستم تیرے
کانٹوں میں ہی گلاب ہوتا ہے
کیوں نہ سوچے تمہیں یہاں کوئی
زندہ آنکھوں میں خواب ہوتا ہے
دن برابر ہیں وصل کی صدیاں
ہجر کا پل عذاب ہوتا ہے
کیوں تم آتے ہو باغ میں ارشد
پھول کا دل خراب ہوتا ہے

ارشد نذیر کاٹھیاں/میاں چنوں

بارہا ٹوٹ کے جڑی ہوں میں
جانے کس چیز کی بنی ہوں میں
میں زیادہ کسی سے کیا ملتی
خود سے بھی کم ہی تو ملی ہوں میں
کبھی کبھی تو حیرت ہوتی ہے
کیسے اب تک یوں جی رہی ہوں میں
کیسے ترتیب میں ہو سب آخر
بکھری بکھری سی ہر گھڑی ہوں میں
جانے آسیب کیسا ہے مجھ میں
خود سے ہر وقت بھاگتی ہوں میں
من کے آنگن میں سونا پن ہے بہت
دیکھو کتنی بجھی بجھی ہوں میں
میں یہاں اور کسی کو کیا جانوں
خود کو کب پورا جانتی ہوں میں

کائنات طارق/جڑانوالہ

مسافت میں گزاری ہے یہ عمرِ مختصر میں نے
غبار و گرد کو جانا ہے اپنا ہمسفر میں نے
تمہاری یاد کے شعلے بھڑک اُٹھے میرے دل میں
سرِ مژگاں سجائے ہیں تمنا کے گہر میں نے
اداسی چھا گئی ہے شہر کے سارے ہی رستوں پر
سنی ہے جب سے تیرے جانے کی ہمدم خبر میں نے
اسی کو سامنے پایا وہی مجھ کو نظر آیا
اُٹھائی جس طرف اور جب بھی اپنی نظر میں نے
وہ آیا تھا مگر اک پل کو بھی ٹھہرا نہیں دل میں
سجائی تھی گلوں سے گرچہ ساری رہگذر میں نے
مقام ایسے بھی آئے عشق کی راہوں میں اے نگہت
نظر آتے ہو تم ہی تم کہ دیکھا ہے جدھر میں نے

نگہت اکرم/لاہور

مجھے دیکھ کر مسکراتی بہت ہے
بھی ہے سبب دل لبھاتی بہت ہے
سکوں چھین لیتی ہیں جب چاند راتیں
تو مجھ کو تری یاد آتی بہت ہے
جو گھر کے شجر پہ یہ بیٹھی ہے چڑیا
یہ اب درد لہجے میں گاتی بہت ہے

اسی واسطے لوگ پنگھٹ پہ آئیں
کہ بگلی یہاں آتی جاتی بہت ہے
یہ انور ترا بھی ہے رہتا پریشاں
تری یاد اس کو ستاتی بہت ہے

انور ندیم

کر رہی ہوں میں سفر دو موسموں کے درمیان
بن کے خورشید و قمر دو موسموں کے درمیان
سایۂ دیوار میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ طیور
کٹ گئے جن کے شجر دو موسموں کے درمیان
کیا اُٹھاؤں ہاتھ میں اپنے دعا کے واسطے
ہر دعا ہے بے ثمر دو موسموں کے درمیان
زندگانی کی حرارت، بے حرارت ہو گئی
کھل گئے سارے ہنر دو موسموں کے درمیان
جب سے میرا منزلوں سے ہو گیا ہے سامنا
تب سے ہوں اپنی خضر دو موسموں کے درمیان
گلشوں کو چھوڑ کر آئے کنول کیا جھیل میں
خوشبوئیں ہیں دربدر دو موسموں کے درمیان

ایم، زیڈ، کنول/لاہور

مہ تمام کی شب یاد آنے لگتا ہے
وہ یاد آئے تو سب یاد آنے لگتا ہے
کسی کی بات میں آ کر وہ بھولنے والا
بہت ہی آتا ہے جب یاد آنے لگتا ہے
کبھی کبھی مجھے اپنی خبر نہیں رہتی
کبھی کبھی مجھے سب یاد آنے لگتا ہے
تمہارے حسن کی تعریف، مختصر یہ ہے
کہ تم کو دیکھ کے رب یاد آنے لگتا ہے

شبیر نازش/کراچی

اگر میں خواب کی تشکیل تک پہنچ جاؤں
تو کائنات کی تکمیل تک پہنچ جاؤں
کنول کا بیج ہوں اور خاک پر پڑا ہوا ہوں
دُعا کرو میں کسی جھیل تک پہنچ جاؤں
بلند ہوتی ہوئی خاک کی تمنا ہے
میں آسمان کی تحویل تک پہنچ جاؤں
میں آفتاب پہ چلتا ہوں اور سوچتا ہوں
تمہارے حسن کی قندیل تک پہنچ جاؤں
میں بے نیاز ہوں تجھ سے وگرنہ چاہوں تو
تری خوشی سے تفصیل تک پہنچ جاؤں

شجاع شاذ

ماں! تم خوب رُلاتی ہو
یاد بہت ہی آتی ہو
ماں تم خوابوں میں آ کر
میرا درد بٹاتی ہو
جب میں تنہا ہوتی ہوں
کوئی گیت سناتی ہو
ساتھ نہیں ہو پھر بھی تم
میرا ساتھ نبھاتی ہو
اس دنیا سے میرے لیے
اس دنیا میں آتی ہو
ماں تم کتنی اچھی ہو
مجھ سے مجھے ملواتی ہو

تمثیلہ لطیف/ڈسکہ

"شام بے چین ہے" اور "تیرے خیال کا چاند" کے بعد احمد حماد کی نئی کتاب

وقت نے لوحِ قربت کے اُتارے بدلے
ترے جاتے ہی مرے چاند ستارے بدلے

محبت بھیگتا جنگل

شائع ہو گئی ہے

ناشر: جہانگیر بکس
ڈسٹری بیوٹرز: "دی رائٹرز" اے زی، بک سنٹر، شاہ کمال روڈ، راواں، رحمٰن پورہ، لاہور

جدید غزل کے معروف شاعر جاوید قاسم کا دوسرا شعری مجموعہ

کوئی چشمہ نکل آئے

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گئی ہے

ناشر: علی عون پبلی کیشنز، لاہور

روس کی ایک جھلک

پروفیسر جمیل آذر

''روس کی ایک جھلک'' سلمیٰ اعوان کا تازہ سفرنامہ ہے جو گذشتہ سال 2010ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آیا۔ اس سفرنامے سے پہلے اُن کے تین مُلکی اور ایک غیر مُلکی سفرنامے قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ مُلکی سفرناموں میں ''یہ میرا بلتستان''، ''میرا گلگت و ہنزہ'' اور ''سندر چترال'' اور غیر مُلکی سفرنامہ میں ''مصر میرا خواب'' شامل ہیں۔ اس طرح ان کے اب تک بشمول اس سفرنامہ کے پانچ سفرنامے ایوانِ اُردو میں جگمگا رہے ہیں۔ یہ اُن کی بہت بڑی کامیابی ہے اور ابھی تین سفرنامے مزید طباعت کے مراحل سے گزر رہے ہیں جن میں ''نوحہ عراق کا''، ''میں گئی سیلون'' اور ''استنبول'' شامل ہیں۔ ان کارہائے نمایاں (achievements) سے صاف ظاہر ہے کہ سلمیٰ اعوان پیدائشی طور پر سیاح ہیں۔ خالقِ کائنات نے انہیں تخلیق ہی اس مقصد کے لئے کیا ہے کہ وہ قریہ قریہ، مُلکوں مُلکوں گھومیں پھریں اور ربِ کائنات کی تخلیق کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں۔ خود بھی اس پُراسرار کائنات سے لطف اندوز ہوں اور دوسروں کو بھی اس میں شریک کریں۔ اپنے اس مقصد میں سلمیٰ اعوان نہایت کامیاب ہیں۔ وہ سفرنامہ نگار ہی نہیں بلکہ ناول نگار اور افسانہ نویس بھی ہیں۔ ان کے پانچ ناول تا حال چھپ چکے ہیں جن میں تنہا (مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کی داستان)، ہاتھ (1965ء کی جنگ کے پس منظر میں)، گھروندا اک ریت کا، زرغونہ (ایک سماجی اور رومانی ناول) اور شیبہ (ایک سماجی اور رومانی ناول) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بایں ہمہ بحیثیت افسانہ نگار اور کہانی کار اُن کی کہانیوں کا ایک مجموعہ بیچ بچولن شائع ہو چکا ہے جبکہ کہانیوں کے دو مجموعے ''کہانیاں دُنیا کی'' اور ''کہانیاں اپنی'' زیرِ طبع ہیں۔

سلمیٰ اعوان سے بالمشافہ میری ملاقات ابھی تک نہیں ہوئی ہے تاہم میرا اُن سے پہلا تعارف ملک مقبول احمد کی کتاب ''سفر جاری ہے'' کے توسط سے ہوا جس میں اُن کی خوبصورت رنگین تصویر دیگر خواتین مصنفین کے ساتھ ساتھ موجود ہے۔ ملک مقبول احمد ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا قدر دان ہے انہیں جہاں بھی علم و دانش کے موتی نظر آتے ہیں وہ چُن چُن کر انہیں مقبول اکیڈمی میں سجا لیتے ہیں۔ سلمیٰ اعوان بھی علم و دانش کا موتی ہیں اور مقبول اکیڈمی میں اپنی انفرادی شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ مقبول اکیڈمی میں اُن کی تصانیف ''میرا گلگت و ہنزہ'' اور ''تنہا'' پوری سج دھج کے ساتھ موجود ہیں۔ ملک مقبول احمد اپنی کتاب ''سفر جاری ہے'' میں اُن کا تعارف اِن الفاظ سے کراتے ہیں۔ ''محترمہ سلمیٰ اعوان ایک اعلیٰ پائے کے سکول کی سربراہ ہیں اور بہت اچھی ناول نویس بھی ہیں۔ برادری کے حوالے سے میری بہن ہیں لیکن کبھی کبھی معمولی سی بات پر مجھے ڈانٹ بھی پلا دیتی ہیں۔ اس وقت اُن کا رُوپ مصنفہ کا نہیں استانی کا ہوتا ہے۔ اُن کی جو کتابیں میں نے شائع کی ہیں ان میں ''میرا گلگت و ہنزہ'' اور ''تنہا'' قابلِ ذکر ہیں۔ یوں سلمیٰ اعوان میرے ذہن کے کسی گوشے میں طلسماتی طور پر چھپ کر بیٹھ گئیں۔ اس مصروف دُنیا میں کون کسی کو یاد رکھتا ہے لیکن میرا ایک ایمان ہے کہ ہم جب کسی کو روحانی طور پر یاد کرتے ہیں یا وہ روحانی طور پر ہمارے دل میں ہوتا ہے تو ہمارا ایک روحانی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے دُنیا دار عملی لوگ (Pragmatic people) سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ایک روز میری نظر استنبول کے حوالے سے لکھے ہوئے ایک مضمون پر پڑی تو اس تحریر کی مصنفہ کا نام سلمیٰ اعوان بھی پڑھا۔ یہ مضمون (سفرنامہ کے طور پر) کسی اخبار میں میری نظر سے گزرا تھا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ پھر اچانک ایک روز ڈاک میں ایک کتاب موصول ہوئی۔ یہ کتاب سلمیٰ اعوان کی ''روس کی ایک جھلک'' کے نام سے تھی اور جسے انہوں نے نہایت خلوص و محبت کے ساتھ مجھے ارسال کی تھی اور ساتھ ہی ایک خط

بھی تھا جس میں انہوں نے ازراہ لطف وکرم اِس کتاب پر چند حروف لکھنے کے لیے بھی کہا۔ میں اُوپر عرض کر چکا ہوں کہ میرا اُن سے غائبانہ و روحانی رشتہ تو پہلے ہی استوار ہو چکا تھا اسی لئے انہوں نے یہ کتاب مجھے خاص طور پر بھجوائی۔ اِس کتاب سے ملنے سے پہلے مُلک کی ایک نامور مصنفہ نے جو ایک ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کے اعزاز میں ہمارے مُلک کے کئی ادیب اور شعرا مضامین لکھ چکے ہیں مجھے ٹیلیفون کیا اور اپنی کتابوں کے حوالے سے مضمون لکھنے کی درخواست کی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں آج کل علیل ہوں۔ بڑھاپا اور بیماری اِن دونوں نے میرا بھرکس نکال دیا ہے۔ میں نے اُن سے معذرت کر لی جو انہوں نے کشادہ دلی سے قبول کر لی لیکن جب سلمیٰ اعوان کی کتاب آئی اور انہوں نے بھی اس کے چند حروف لکھنے کے لیے کہا تو انکار نہ کر سکا لیکن مہلت طلب کی جسے انہوں نے فوراً قبول کر لیا ۔لیکن میں اپنی عادت سے مجبور ہوں جب میں کسی سے وعدہ کر لیتا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ وعدہ میں نے اپنے رب کائنات سے کیا ہے اور اسے جلد از جلد پورا کرنا چاہیے اور جب تک یہ کام پورا نہیں ہوتا میں بے کل رہتا ہوں۔ اپنی علالت کے باوجود میں اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔

''روس کی ایک جھلک'' کا پہلا ہی باب پڑھا لطف آ گیا۔ مصنفہ کی کرداروں کے مشاہدہ پر گہری دسترس ہے۔ زبان میں بے تکلفی اور بیان میں بول چال کا اسلوب سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مصنفہ حُسن پرست ہیں۔ وہ جب پی۔آئی۔اے کی موجودہ ایرلائنز میں سفر کرتی ہیں تو اپنی پسند اور ناپسندیدگی کا اس طرح اظہار کرتی ہیں۔

''فضائی میزبان خواتین الف سے ے تک سب گوارہ اور گزارا تھیں۔ مرد بھی ایسے ہی جھانپڑ سے تھے۔ پتہ نہیں پی۔آئی۔اے کے ہاں حُسن مرد و زن کا قحط کیوں پڑ گیا ہے؟ یا سلیکشن بورڈ حُسن بلائنڈ ہو گیا ہے'' اس جملے میں لفظ ''جھانپڑ'' مزہ دے گیا ہے۔ یہ مصنفہ کا اظہار بیان میں بے تکلفی اور عام بول چال کے الفاظ کو سلیقے سے استعمال کرنے کے فن کی نشان دہی کرتا ہے۔ جب اسلوب میں بے تکلفی، بے ساختگی (Spontaneity) اور سادگی جلوہ گر ہوتی ہے تو انشائی رنگ (تخلیقی رُوپ) اختیار کر لیتا ہے۔ اِس اسلوب سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے اور اُسے مفہوم و معنی کے ادراک میں مشکل کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ سلمیٰ اعوان کا اسلوب بیان سادہ، رواں اور دلچسپ ہے اور قاری کو شروع سے لے کر آخر تک اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ سلمیٰ اعوان نے جس حُسن کے فقدان کا پی۔آئی۔اے کی پرواز میں ادراک کیا ہے اس کا مجھے بھی احساس ہوا تھا جب مجھے راولپنڈی سے کراچی تک اور واپسی میں اپنی ملکی پرواز میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن جب میں نے راولپنڈی سے دوبئی کا سفر ایمریٹ ایرلائنز سے کیا تھا تو سبحان اللہ لڑکے اور لڑکیوں کا حُسن و رعنائی قابلِ رشک تھا۔ اس پر مستزاد اُن کی مستعدی، خوش خلقی اور میزبانی کے فرائض قابلِ تعریف تھے اور اب تو پی۔آئی۔اے کی پروازوں میں مسافروں کو لنچ گتوں کے ڈبوں میں اس طرح دیا جاتا ہے جیسے اُن کی تواضع نہیں بلکہ انہیں خیرات دی جا رہی ہو۔

مصنفہ جب روس کی سرزمین پر قدم رکھتی ہے تو سب سے پہلے انہوں نے ''وضو کیا اور خوبصورت مسجد میں سجدہ دیا''۔ نماز واقعی مومن کی معراج ہے۔ اس سے اطمینان قلب اور روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ سرد جنگ کے اختتام کے بعد روس کی غربت کا سلمیٰ اعوان نے صحیح اندازہ لگایا۔ ''روس کی غربت کا وہ حال تھا کہ اترنے سے قبل مسافر ہم سے بچی کھچی ڈبل روٹیاں، چاول، انڈے بھی سمیٹ کر لے جاتے تھے۔ خدا گواہ ہے میں تو خوف سے لرز جاتی تھی اور اُن کے تھیلے ویلے سب بھر دیا کرتی تھی''۔ مجھے تو ڈر ہے کہ یہی صورت حال کہیں ہمارے ہاں بھی نہ ہو جائے۔ اِس سفرنامہ میں مصنفہ نے فطرت کی منظر کشی کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ قاری اِن فطری مناظر سے انبساط حاصل کرتا ہے ''بادلوں کی بھی ایک اپنی دُنیا ہے۔ کتنے رنگ ہیں ان کے۔ نہ انہیں چین، نہ قرار، ہمہ وقت یوں بھاگتے پھرتے ہیں جیسے پولیس تعاقب میں ہے''۔ جب جہاز ایرپورٹ پر اُترنے لگا تو مصنفہ جہاز کی کھڑکی سے کریملن کا نظارہ حیرت و استعجاب سے کرتے ہوئے اس طرح تصویر کشی کرتی ہے۔ ''ہائے میرے اللہ کریملن! میں نے آنکھیں پھاڑ کر شیشے سے چپکا لیں، سرسبز تمکین بلند قطعے پر سُرخ دیواروں کی ایک ٹیڑھی میڑھی تکون میں جیسے کسی

نے یہاں وہاں سبز چنبیلی رنگے سُرخ سبز موتیوں کی ڈھیریاں رکھ دی ہوں۔''

''روس کی ایک جھلک'' جو 46 ابواب اور 484 صفحات پر مشتمل ہے محض کتاب نہیں بلکہ ایک طلسم ہوش ربا میوزیم ہے جس میں قاری داخل ہو کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ آپ جُوں جُوں کتاب پڑھتے جاتے ہیں تُوں تُوں روس کی بلند و بالا عمارات، باغات، تاریخی محلات، قد آور شخصیتوں کے مجسمات، صاف ستھری سڑکیں، نظم و نسق کا انتظام، نیلے پانیوں کے سمندر اور آبشاروں سے لطف اندوز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ روسی قوم کے تعمیری جذبوں کو مصنفہ اِن الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ ''روسی قوم کے اُن جذبوں کو سلام! جنہوں نے بڑے بڑے محل میناروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے گلی کوچوں اور اُن کے چوراہوں تک میں بکھری تاریخ کو رنگ و آہنگ کے پیرہن پہنا کر یوں معتبر بنا ڈالا کہ آج ثقافتی و تاریخی ورثے سے مالا مال ملکوں میں روس بہت نمایاں اور سربلند ہے۔'' مصنفہ نے نہایت احترام کے ساتھ اُن بے نام انسانوں کے نام اپنی کتاب کا انتساب کیا جنہوں نے روس کی ایک جھلک دکھانے میں اُن کی راہنمائی کی۔ یہ خوبصورت انداز انتساب آپ سلمیٰ اعوان کے الفاظ میں خود ہی پڑھیے اور اُن کے حُسنِ ہنرمندی کی داد دیجیے۔ ''اُن سب کے نام جو انسانوں کے بے کراں ہجوم میں اِک ذرا رُکے، جھکے، ہاتھ تھاما، راہ دکھائی اور روس کی تھوڑی سی چہرہ شناسی میں مدد دی''۔ بہت خوب سلمیٰ اعوان، بہت خوب! سلمیٰ اعوان بہت عمدہ افسانہ نگار ہیں، انہیں اپنے قلم پر مضبوط گرفت ہے اور جزیات نگاری کا فن آتا ہے۔ مصنفہ ایک لڑکے کو بیج کھاتے اور ٹی وی دیکھنے میں محو دیکھتی ہے۔ بحیثیت افسانہ نگار بھلا وہ اِسے بغور دیکھے بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔ تجسس کے زیرِ اثر اس لڑکے سے کہتی ہے اور کہتی بھی باڈی لینگویج (body language) میں یعنی اشاروں سے ''کہ جو تم ٹھونگ رہے ہو مجھے بھی تھوڑے سے دو''۔ اس پر اُس نے اُن کی ہتھیلی پر سیاہ بیج رکھ دیے۔ یہ نمک میں بھنے ہوئے کدو کے بیج تھے لیکن اس لڑکے کے کھانے کے سلیقہ سے مصنفہ بہت متاثر ہوتی ہے کیونکہ وہ بیج کھا کر اس کے چبائے ہوئے چھلکے زمین پر پھینکنے کی بجائے اپنے ہاتھ میں اکٹھے کرتا تھا تاکہ وہ انہیں اُس جگہ پر پھینکے جہاں کوڑا کرکٹ پھینکنے کے ڈھکن دار بڑے بڑے ڈسٹ بن (Dust Bin) رکھے ہوتے ہیں۔ اس خورد و نوش کے سلیقے پر مصنفہ اِس طرح اپنے ردِعمل کا اظہار کرتی ہے۔ ''اس نے میری ہتھیلی پر سیاہ بیج رکھ دیے۔ نمک کے استر میں لپٹے ہوئے۔ بیج تو وہی کدو کے۔ پر کھانے کے انداز میں قوموں کی تہذیب اور چلن بولتا تھا۔'' مصنفہ نے مصر کا دورہ بھی کیا ہوا تھا۔ اب اس کا دھیان مصر میں لکسر کے ایک ریلوے اسٹیشن کی طرف چلا جاتا ہے جہاں اس نے ایک مصری کو کچھ ایسے ہی بیج کھاتے دیکھا تھا۔ اب آپ اس تقابل کا منظر مصنفہ کے الفاظ میں پڑھیے۔ ''مصر میں لکسر کے ریلوے اسٹیشن پر میں نے ایک مصری کو انہیں کھاتے دیکھا۔ چھلکوں کا ڈھیر اُس نے اپنے اردگرد پھیلا رکھا تھا''۔ اس کے برعکس استنبول میں صفائی ستھرائی کا یہ طریقہ تھا۔ ''استنبول میں ایک چھلکا زمین پر بکھرے نہیں دیکھا اور یہی حال یہاں تھا۔ لڑکا چھلکا دائیں ہاتھ میں اکٹھے کیے جاتا تھا۔'' یہی وہ جزیات نگاری ہے جس نے اس سفر نامہ کو نہ صرف دلچسپ بنا دیا ہے بلکہ ہمیں غور و فکر کے لمحات عطا کیے ہیں۔

سلمیٰ اعوان نے اپنے سفر نامہ کو رنگین تصویروں سے مزین کیا ہوا ہے جس سے قاری روس کی تاریخی عمارتیں، سائبیریا کی نسل کے بچوں اور لوگوں کے خدوخال اور مشہور قومی شخصیتوں کی تصویروں کو دیکھ کر حیرت انگیز طور پر مسرور ہوتا ہے۔ میرے سامنے یہ ایک تصویر روس کے بے نظیر شاعر الیگزنڈر پشکن کی ہے اور اس کے ساتھ نتالیہ پشکن کی پُرکشش تصویر بھی ہے۔ اِن دو تصویروں کے نیچے مونیکا (Monika) نہر کے کنارے اس عظیم شاعر کا وہ گھر دکھایا گیا ہے جہاں اس نے زندگی کی آخری سانسیں لیں۔ آئزک سکوائر میں آئزک کیتھڈرل کی تصویر، ڈسمبرسٹ سکوائر میں پیٹر دی گریٹ کا کانسی کے مجسمہ کی تصویر اور دیگر جاذبِ نظر منظروں کی تصویریں دیکھ کر قاری ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ خوبصورت سفرنامہ ایک حقیقی ناول بھی ہے اور بھرپور تاثر بھی، افسانہ بھی ہے اور حقیقت بھی، پوری گیلری بھی ہے اور چلتے پھرتے انسانوں کا انبوہ کثیر بھی۔ مجھے حیرت ہے کہ سلمیٰ اعوان نے روس جیسے اپنے وقت کی سُپر طاقت کو اپنے قلم کی گرفت میں بڑی مہارت اور ہنرمندی سے لے لیا ہے اور ہمیں نصیحت غیر مترقبہ سے مستفید کیا ہے۔ میں انہیں اس دل پذیر سفر نامہ پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ دوست پبلی کیشنز اسلام نے اِس کتاب کو نہایت قیمتی کاغذ پر طبع کیا ہے جو ناشر اور مصنف کے ذوقِ حُسن کی غمازی کرتا ہے۔ مجھے اُمید ہے مصنفہ کی یہ تصنیف شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کرے گی۔

●●●

ادبی خبریں/تقریبات

معروف مزاح نگار حافظ مظفر محسن کی کتاب ''بونا نہیں بے وقوف'' کی تقریب رونمائی

لاہور (پ ر) معروف شاعر اور مزاح نگار حافظ مظفر محسن کی کتاب ''بونا نہیں بے وقوف'' کی تقریب رونمائی اعتراف انٹرنیشنل کے زیر اہتمام الحمراء میں زیر صدارت عطاء الحق قاسمی منعقد ہوئی۔ مہمان خصوصی سعد اللہ شاہ تھے۔ تلاوت کی سعادت محمد شعیب مرزا نے حاصل کی۔ عبدالمجید چٹھہ نے بارگاہ رسالت ﷺ میں گلہائے عقیدت پیش کیے۔ نظامت کے فرائض عزیر احمد نے انجام دیے۔ عکاس حرمین شریفین عظمت شیخ اور اقبال پیام شجاع آبادی نے حافظ مظفر محسن کو گلدستے پیش کیے۔ اعتراف انٹرنیشنل کے چیئرمین حسن عباسی اور عزیر احمد نے منظوم اظہار محبت کیا۔ سید بدر سعید، ڈاکٹر مختار عزمی، حسن عباسی، گل نوخیز اختر، صوفیہ بیدار، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، عظمت شیخ، حافظ شفیق الرحمن، سعد اللہ شاہ اور صاحب صدارت عطاء الحق قاسمی نے حافظ مظفر محسن کی تحریروں کی بے ساختگی، شگفتگی اور گہرائی کو سراہا اور کہا کہ مظفر محسن جہاں عمدہ مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہیں وہیں ان کا طنز قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ حافظ مظفر محسن نے تمام دوستوں کی محبت اور خلوص کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں آپ سب کی محبت کا تحریری طور پر بدلہ لوں گا۔ مقررین کے برجستہ جملوں کی وجہ سے تقریب کشت زعفران بنی رہی۔ تقریب میں لاہور اور بیرون شہر سے شاعروں اور ادیبوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

اعتراف انٹرنیشنل کے زیر اہتمام عطاء الحق قاسمی کے اعزاز میں ظہرانہ

لاہور (پ ر) ادبی تنظیم اعتراف انٹرنیشنل نے نامور کالم نگار، مزاح نگار، ڈرامہ رائٹر، شاعر اور ادیب عطاء الحق قاسمی کو مجلس فروغ اُردو ادب دوحہ قطر کی جانب سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ملنے پر ہالیڈے ان میں ایک ظہرانے کا اہتمام کیا۔

تقریب میں ملک کی نامور ادبی اور سماجی شخصیات نے شرکت کی۔ جن میں رخسانہ نور، وصی شاہ، ڈاکٹر امجد پرویز، شازیہ نورین (اٹلی)، فرحت زاہد، زاہد سعید، مرشد سعید ناصر، رضوانہ سعید روز، ایم آر شاہد، حافظ مظفر محسن، ناصر زیدی، عزیر احمد، قمر رضا شہزاد، شاہین عباس اور ابرار ندیم نے شرکت کی۔

''اعتراف'' کے چیئرمین حسن عباسی نے عطاء الحق قاسمی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ عطاء الحق قاسمی ہمارے عہد کے نامور کالم نویس، ڈرامہ رائٹر، مزاح نگار اور شاعر ہیں۔ انہوں نے یہ ایوارڈ قبول کر کے ایوارڈ کے اعتبار میں اضافہ کیا ہے۔ وہ بلاشبہ ایک عظیم مزاح نگار ہیں۔ اُن جیسے ادیب صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔

تقریب میں عطاء الحق قاسمی کی ادبی خدمات کے روشن پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا۔ اس موقع پر حافظ مظفر محسن، ڈاکٹر امجد پرویز، قمر رضا شہزاد، سعید ناصر، وصی شاہ اور رخسانہ نور نے بھی عطاء الحق قاسمی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔

آخر میں عطاء الحق قاسمی نے اپنے مخصوص انداز میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی میرے منہ پر میری تعریف کرے تو مجھے برا لگتا ہے اور تعریف نہ کرے تو زیادہ برا لگتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی سے متعلق بہت کچھ بتایا کہ ان کا بچپن کیسے گزرا۔ کہاں کہاں تعلیم حاصل کی۔ کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور کس طرح اپنے شب و روز گزارتے ہیں۔ اظہار خیال کے دوران انہوں نے اپنے شگفتہ جملوں سے محفل کو کشت زعفران بنائے رکھا۔

اعتراف انٹرنیشنل کے زیر اہتمام محفل مشاعرہ

الحمراء ادبی بیٹھک لاہور میں معروف ادبی تنظیم اعتراف انٹرنیشنل کے زیر اہتمام محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس کی صدارت معروف بزرگ شاعر جمیل یوسف نے کی۔ مہمان خصوصی کبیر والہ سے تعلق رکھنے والے جدید غزل کے مقبول شاعر قمر رضا شہزاد تھے۔ مہمانان اعزاز میں سعود عثمانی، ڈاکٹر کوثر محمود اور شازیہ نورین (اٹلی) تھیں۔ اس خوبصورت محفل مشاعرہ کی نظامت

مقبول شاعر اور اعتراف انٹرنیشنل کے چیئرمین حسن عباسی نے کی۔ تلاوت کی سعادت شعیب مرزا نے حاصل کی۔ نعت پڑھنے کا شرف عبدالمجید چٹھہ نے حاصل کیا۔ جن شعراء نے اپنا کلام پیش کیا اُنکے اسمائے گرامی ہیں۔ وسیم عباس، محمد اقبال پیام شجاع آبادی، کامران ناشط، شجاع شاز، احمد سجانی آکاش، سید فراست رضوی، کنور امتیاز احمد، حسن بانو، ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ، عاقر شہزاد، ڈاکٹر صغریٰ صدف، لطیف ساحل، شفیق احمد خاں، جاوید رضی، فیصل نواز، چوہدری (ناروے)، صفدر علی آغا (ڈنمارک)، فرحت زاہد (امریکہ)، زاہد سعید امریکہ اور شازیہ نورین (اٹلی) مہمانِ خصوصی قمر رضا شہزاد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ عموماً ہمارے ہاں اگر کسی مشاعرے میں باہر کے ملک کا کوئی شاعر شرکت کرتا ہے تو اُسے عالمی مشاعرے سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ آج یہاں اعتراف انٹرنیشنل کے مشاعرے میں بیرونِ ملک سے پانچ شاعر شریک ہیں۔ لہٰذا یہ ہر حوالے سے ایک جینوئن عالمی مشاعرہ ہے۔ قمر رضا شہزاد اور شازیہ نورین (اٹلی) کی شاعری کو سامعین نے بہت سراہا اور دل کھول کر داد دی۔ آخر میں محفل مشاعرہ کے صدر جمیل یوسف نے کہا کہ میں اعتراف انٹرنیشنل کو اس قدر کامیاب محفل مشاعرہ منعقد کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میری بیگم الحمراء سے باہر گاڑی میں کافی دیر سے میرا انتظار کر رہی ہیں۔ لہٰذا میں ایک غزل سنانے پر اکتفا کروں گا۔ یوں یہ خوبصورت محفل مشاعرہ اختتام پذیر ہوگئی۔

شازیہ نورین کے اعزاز میں محفل مشاعرہ

(لاہور) معروف ادبی تنظیم اعتراف انٹرنیشنل کے زیر اہتمام اٹلی سے آئی ہوئی معروف شاعرہ شازیہ نورین کے اعزاز میں محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ یہ محفل مشاعرہ پنجابی انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج کے پنجابی کیفے میں منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت اُردو غزل کے معتبر شاعر باقی احمد پوری نے کی۔ مہمانِ خصوصی معروف شاعر سعد اللہ شاہ تھے۔ جبکہ مہمانِ اعزاز شازیہ نورین تھیں۔ اس محفل مشاعرہ میں لاہور کے معروف شعراء نے شرکت کی جن شعراء نے اپنا کلام پیش کیا اُن کے اسمائے گرامی ہیں: سلیم صابر، وسیم عباس، جاوید رضی، ریاض رومانی، سردار عظیم اللہ میو، تسنیم کوثر، شبہ طراز، تیمور حسن، مقصود عامر، رضا عباس رضا، جاوید آفتاب، ایم زیڈ کنول، کنور امتیاز احمد، نظامت کے فرائض مقبول شاعر اور اعتراف انٹرنیشنل کے چیئرمین حسن عباسی نے ادا کیے۔ مشاعرے کے دوران سعد اللہ شاہ اور باقی احمد پوری کے مابین دلچسپ اور شگفتہ جملوں کا تبادلہ بھی ہوتا رہا جس نے شعراء اور سامعین کو بہت محظوظ کیا۔ آخر میں شازیہ نورین سے ان کا منتخب کلام سنا گیا جسے شعراء اور حاضرین نے بہت سراہا۔

بزم پرنم کی محفل میلاد مصطفیٰ

بزم پرنم کے زیر اہتمام 7 آبکاری روڈ نزد وارث نہاری ہاؤس نیو انارکلی لاہور میں محفل میلادِ مصطفیٰ انعقاد پذیر ہوئی جس میں نامور نعت خواں شریک ہوئے۔ اُس کے بعد محفل سماع منعقد ہوئی۔ مشہور زمانہ قوال عزیز میاں کے صاحبزادے امیر خسرو عزیز میاں نے نعتیہ قوالیاں پیش کیں۔ حافظ محمد عامر سلیم قادری نے خصوصی خطاب فرمایا اور دعائے خیر کی۔ چیئرمین و بانی بزم پرنم محمد اقبال پیام شجاع آبادی نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ محفل انتظامیہ کے ممبران قصور علی، عقیل، عمران نے بہترین انتظامی امور سرانجام دیے۔

ادب سرائے ساہیوال کا ۲۵۳واں ماہانہ مشاعرہ

ادب سرائے ساہیوال کا ۲۵۳ واں ماہانہ مشاعرہ زیر صدارت جناب اسلم سحاب ہاشمی منعقد ہوا۔ معتمد کے فرائض فاروق اظہر نے انجام دیے۔ مہمانانِ اعزاز جناب عطاء الرحمٰن قاضی اور غلام مرتضیٰ ساجد تھے۔ تلاوت و نعت خوانی کے اعزازات احمد دین قادری نے حاصل کیے۔ صدر ادب سرائے پروفیسر سید ریاض حسین زیدی نے حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ اُنھوں نے مشہور افسانہ نگار ہاجرہ مسرور کے انتقال پر گہرے دُکھ کا اظہار کیا اور اُن کی افسانہ نگاری کے منفرد کمالات کو سراہا۔ سلام، نعت اور غزل کی اصناف پر جناب اسلم سحاب ہاشمی، جناب عطاء الرحمٰن قاضی، جناب غلام مرتضیٰ ساجد، جناب سید ریاض حسین زیدی، جناب ندیم عباس اشرف، جناب انجینئر وقاص، جناب غلام محمد حامی، جناب احمد دین قادری، جناب فاروق اظہر، جناب انضمام الحق نے تازہ کلام سنایا۔ (رپورٹ: ندیم عباس اشرف)

نعتیہ مجموعہ ''مرا محور مدینہ ہے'' کی تعارفی تقریب

پچھلے دنوں حلقہ ادب اور ادارۂ شعور اوکاڑہ کے زیر اہتمام سپیشل ایجوکیشن کمپلیکس اوکاڑا میں معروف شاعر احمد جلیل کے دوسرے نعتیہ مجموعے ''مرا محور مدینہ ہے'' کی تعارفی تقریب کا انعقاد ہوا۔ صدارت پروفیسر اکرم طاہر نے کی۔ جبکہ مہمان خصوصی احمد جلیل تھے۔ مہمانانِ اعزاز میں ڈاکٹر ظفر اقبال راؤ، پروفیسر احمد ساقی، قاری خالد نذیر، اصغر مغل اور علی وارث انصاری تھے۔ مسعود احمد اس پاکیزہ تقریب کے میزبان تھے۔ پروفیسر ندیم اصغر نے نقابت کے فرائض بطریق احسن نبھائے۔ جن شعرائے کرام اور دانشورانِ ذی وقار نے احمد جلیل کی شخصیت اور فن نعت گوئی کے حوالے سے گفتگو کی اُن میں پروفیسر اکرم طاہر، ڈاکٹر ظفر اقبال راؤ، پروفیسر احمد ساقی، مسعود احمد، رضا اللہ حیدر، سخنور مجی، علی وارث انصاری، قاسم علی کوثر اور جہانزیب کے نام شامل ہیں۔ باذوق سامعین کی کثیر تعداد بھی اس تقریب کا حصہ بنی۔

آغاز تقریب قاری اختر رضا صدیقی نے تلاوت کلام پاکؑ سے کیا۔ ثنائے رسول کی سعادت امین انجم کے حصے میں آئی۔ بعد ازاں نقیب محفل پروفیسر ندیم اصغر نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ احمد جلیل کی نعتیہ شاعری نعت کی روایت کو جدتوں اور نئی جہتوں سے روشناس کراتی ہے۔ میزبانِ تقریب مسعود احمد نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور احمد جلیل کی نعتیہ شاعری کی تحسین کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی نعتیں بالخصوص نظمیں نعتیہ ادب کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ قاسم علی کوثر نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ان کی نعتیہ شاعری الہامی کیفیتوں سے عبارت ہے۔ ان کا ہر شعر انتخاب نظر آتا ہے۔ سخنور مجی نے کہا احمد جلیل کا نعتیہ مجموعہ خوبصورت اشعار سے مزین ہے۔ ان کے بعض اشعار تو قرآنی آیات کی تفسیر محسوس ہوتے ہیں۔ رضا اللہ حیدر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا احمد جلیل کی شاعری کا مرکز و محور عشق رسولؐ ہے۔ اُن کے نعتیہ اشعار میں پاکیزہ جذبے دھڑکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ علی وارث انصاری نے کہا کہ سب سے پہلا نعت خوانِ رسولؐ خود اللہ رب العزت ہے۔ کعبہ، کلیسا، مندر، گرجا الغرض کائنات کی ہر شے کا مرکز و محور مدینہ ہے۔ احمد جلیل نعت کہہ کر خوبصورت لہجے میں سنت خداوندی ادا کر رہے ہیں۔ پروفیسر احمد ساقی نے یا اظہار خیال کرتے ہوئے کہا نعت گوئی رسول خدا کے گرد طواف کرنے کا نام ہے اور احمد جلیل کی نعتیہ شاعری میں اس پاکیزہ طواف کا عکس بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر ظفر اقبال راؤ نے فلسفہ عشق رسول کے دریا کو کوزے میں بند کرتے ہوئے کہا کہ نعت منزلِ عشق پر پہنچنے کا پہلا زینہ ہے۔ نعت گوئی کے ذریعے احمد جلیل اس منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ صدر محفل پروفیسر اکرم طاہر نے گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا کہ کسی شاعر کا نعت کی طرف آنا بڑی سعادت کی بات ہے۔ ان کے ہاں نعت کا ایک نیا آہنگ نظر آتا ہے۔ اُن کی نعتیہ شاعری نعت کی قدیم روایت کا جدید تسلسل ہے۔

بعد ازاں کلامِ شاعر بزبانِ شاعر کے زیر عنوان احمد جلیل نے اپنا نعتیہ کلام سنایا جسے جملہ سامعین نے خوب سراہا۔ آخر میں بین الاقوامی شہرت کے حامل آرٹسٹ اور خطاط اصغر مغل نے احمد جلیل کو سالِ رواں کے بہترین نعت گو شاعر کا ایوارڈ پیش کیا۔ اس کے بعد ادبی تنظیم ''روش'' ضلع اوکاڑا کے صدر احتشام جمیل شامی نے ''روش'' کی طرف سے احمد جلیل کو پرائیڈ آف پاکستان کی شیلڈ پیش کی۔ یوں یہ پاکیزہ تقریب کملی والے کی مدحتوں کی مہکاریں بکھیرتی ہوئی اختتام پذیر ہوئی۔ (رپورٹ: احتشام جمیل شامی)

ادب سرائے ساہیوال کے زیر اہتمام سالانہ نعتیہ مشاعرہ

فعال ادبی تنظیم ''ادب سرائے'' ساہیوال کے زیر اہتمام ۲۵۵واں ماہانہ ادبی اجلاس سالانہ نعتیہ مشاعرہ کی صورت میں صدر بزم پروفیسر سید ریاض حسین زیدی کی اقامت گاہ فرید ٹاؤن میں منعقد ہوا۔ منعقدہ مشاعرے کی صدارت معروف شاعر مظہر بخاری (میاں چنوں) نے کی۔ مہمان خصوصی پرنسپل گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی ساہیوال انجینئر جاوید مصطفیٰ چودھری جبکہ مہمانانِ اعزاز مرتضیٰ ساجد اور اسلم سحاب ہاشمی تھے۔ اس موقع پر جن شعرا نے بارگاہِ رسالت مآبؐ میں گلہائے عقیدت نچھاور کیے۔ ان میں انضمام الحق، انجینئر ندیم وقاص، غلام محمد حامی، احمد دین قادری، فاروق اظہر، غضنفر عباس سید، پروفیسر سید ریاض حسین زیدی، اسلم سحاب ہاشمی، مرتضیٰ ساجد، جاوید مصطفیٰ اور مظہر بخاری کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ نقابت کے فرائض فاروق اظہر نے ادا کیے۔ سالانہ نعتیہ مشاعرے کے اختتام سے قبل صدر ادب سرائے ساہیوال پروفیسر سید

ریاض حسین زیدی نے محفل کے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں پرتکلف عشائیہ کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ یاد رہے ادب سرائے کے ماہانہ اجلاس ۱۹۹۵ء سے تواتر کے ساتھ منعقد ہو رہے ہیں۔ ان اجلاسوں میں شعر و ادب کی سربرآوردہ شخصیات شرکت کر چکی ہیں۔

حلقہ ادب کے زیرِ اہتمام نعتیہ مشاعرہ

پچھلے دنوں حلقہ ادب اوکاڑا کے زیر اہتمام چوہدری محمد اشرف کی رہائش گاہ پر نعتیہ مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت پروفیسر احمد ساقی نے کی۔ جبکہ رانا غلام محی الدین ثاقب مہمانِ خصوصی تھے۔ نقابت کے فرائض پروفیسر ندیم اصغر نے بطریق احسن نبھائے۔ چوہدری محمد اشرف نے کلام خدا سے اس پاکیزہ محفل کا آغاز کیا۔ ثنائے مصطفیٰ کا شرف محبوب احمد کے حصے میں آیا۔ جن شعرائے کرام نے اس متبرک محفل میں بارگاہِ رسالت مآب میں گلہائے عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ان میں پروفیسر احمد ساقی، رانا غلام محی الدین ثاقب، مسعود احمد، احمد جلیل، کاشف مجید، ندیم احسن، قاسم علی کوثر اور امین انجم کے نام شامل ہیں۔ شعراء کے علاوہ کثیر تعداد میں باذوق عاشقانِ رسول بھی اس پاکیزہ محفل کا حصہ بنے۔ اس پاکیزہ محفل سے انتخاب نذرِ قارئین ہے:

نکل کے خیمے سے زینب پکارتی ہی رہی
نبیؐ کا لختِ جگر ہے خیال کیجیے گا
(احمد ساقی)

شہر تسخیر ہوا ہے تو فصیلیں کیسی
تجھ کو جب مان لیا ہے تو دلیلیں کیسی
(رانا غلام محی الدین)

نبیؐ کی نعت کہنے لگ گیا ہے
یہ دل آنکھوں سے بہنے لگ گیا ہے
(مسعود احمد)

آپؐ کا اسوۂ پاک رہبر مرا
آپؐ کی ہر ادا روشنی روشنی
(احمد جلیل)

حق مدحت تو ادا کوئی نہیں کر سکتا
کوئی کوثر ہو کہ حسان رسول عربی
(قاسم علی کوثر)

''ہمارے ہیں حسینؓ''

ساہیوال میں مقیم معروف شاعر، نقاد اور پی ٹی وی لاہور کے سینئر پروڈیوسر علی رضا کی مرتب کردہ کتاب ''ہمارے ہیں حسینؓ'' شائع ہو گئی ہے جس میں تقریباً دو سو شاعروں اور شاعرات کے سلاموں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ کتاب میں قائم نقوی، ڈاکٹر علی ظہیر منہاس، آفتاب راجا، سرفراز سیّد، اعتبار ساجد اور ایزد عزیز کی آراء بھی شامل ہیں۔ دیباچہ پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے تحریر کیا ہے۔ جبکہ مرتب علی رضا کی اپنی تحریر بھی خوشبوئے مودّت کے نام سے شامل کتاب ہے۔ ۲۰۸ صفحات پر محیط اس کتاب میں احمد ندیم قاسمی، آغا مسعود رضا خاکی، اختر حسین جعفری، افتخار عارف، پروین شاکر، احمد فراز، سیّد نصیر الدین نصیر (گولڑہ شریف)، قیصر بارہوی، منیر نیازی، محسن نقوی، مشکور حسین یاد، ڈاکٹر خورشید رضوی، ظفر اقبال، امجد اسلام امجد، ظہیر کاشمیری، نصیر ترابی، سلیم کوثر، حفیظ تائب، جعفر شیرازی، ناصر شہزاد، رانا غضنفر عباس، اقبال طارق، خالد احمد، حسن عباسی، واصف سجاد، بہزاد جاذب، غضنفر عباس سیّد اور دیگر بہت سے نامور شعراء کے کلام کو شامل کیا گیا ہے۔ یاد رہے علی رضا کی یہ چوتھی کتاب ہے اس سے قبل ان کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

لاہور میڈیکل اینڈ ڈیسنٹ کالج میں محفل مشاعرہ

انگریزی کی معروف شاعرہ اور ڈاکٹر محترمہ شاہینہ آصف نے لاہور میڈیکل اینڈ ڈیسنٹ کالج میں ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا جس میں ڈاکٹر شاہینہ آصف، حسن عباسی، زاہد سعید، فرحت زاہد، تسلیم کوثر اور ڈاکٹر کوثر محمود نے اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرے کی خاص بات یہ ہے کہ تہذیبی اقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے مشاعرہ گاہ کو نہایت خوبصورت انداز میں سجایا گیا تھا۔ گاؤ تکیے، ہر طرف گلاب کے پھول اور طشتریوں میں شعراء کو پان پیش کرتی ہوئی خوبصورت طالبات نے مشاعرے کو چار چاند لگا دیے شعراء نے اپنا بہت سا کلام سنایا اور اچھے شعروں پر طلباء و طالبات نے دل کھول کر داد دی۔

معروف شاعر اور سفرنامہ نگار حسن عباسی کی کتب کے تازہ ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں

① ہم نے بھی محبت کی ہے (شعری مجموعہ) صفحات 160 قیمت -/200 روپے ② ایک محبت کافی ہے (شعری مجموعہ) صفحات 160 قیمت -/200 روپے
③ اک شام تمہارے جیسی ہو (شعری مجموعہ) صفحات 160 قیمت -/200 روپے ④ محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو (سفرنامہ) صفحات 228 قیمت 250
⑤ ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا (سفرنامہ) صفحات 250 قیمت -/300 ناشر: تخلیق پبلی کیشنز، فیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

تبصرۂ کتب

نام کتاب: وہ قربتیں، یہ فاصلے　　افسانہ نویس: ڈاکٹر انور نسیم　　صفحات: ایک سو چوبیس　　قیمت: ۲۲۰ روپے

ناشر: دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد　　تبصرہ نگار: ڈاکٹر رشید امجد

ڈاکٹر انور نسیم سے میرا پہلا تعارف ساٹھ کی دہائی میں "پگڈنڈی" امرتسر کی وساطت سے ہوا جس میں ان کے افسانے چھپتے تھے۔ چند افسانے ہی نظر سے گزرے تھے کہ معلوم ہوا کہ وہ کینیڈا چلے گئے ہیں۔ کینیڈا کے قیام کے دوران وہ ادبی محفلوں سے تو منسلک رہے لیکن لکھنے لکھانے کا سلسلہ تقریباً جاتا رہا۔ اس دوران سائنس ان کی تمام تر توجہ کا مرکز تھی اور اسی انہماک اور یکسوئی کی وجہ سے انہوں نے اس میں ایسا نام کمایا کہ آج وہ جنیٹک انجینئرنگ جیسے وسیع شعبے میں اپنی پہچان آپ ہیں۔ میری ان سے دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب ہمارے ایک مشترکہ دوست شاہین چند دنوں کے لیے کینیڈا سے آئے اور ڈاکٹر انور نسیم نے ان کی دعوت کی۔ اسی محفل میں گفتگو کے دوران ڈاکٹر صاحب کی افسانہ نگاری کی بات چلی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے کینیڈا کے قیام کے دوران بھی چند چیزیں لکھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے افسانوں کی خاص بات ان کا تیز مشاہدہ ہے جو انہیں قدرت نے ودیعت کیا ہے اور سائنسی تربیت نے جسے مزید صیقل کیا ہے۔ ادب ہو یا سائنس دونوں کی بنیاد مشاہدے پر ہے اور اب اس بات پر بھی کوئی دو رائے نہیں ہیں کہ ادب کے میدان کا رہ نورد ہو کہ سائنس کی شاہراہ کا رستے اور طریق کار کے فرق کے باوجود دراصل ایک ہی منزل کا متلاشی ہوتا ہے۔

انور نسیم ایک ایسے کہانی کار کے طور پر سامنے آتے ہیں جو چلتے پھرتے کہانی تلاش کر لیتا ہے اور پھر اس میں اپنے تخیل کی رنگ آمیزی کر کے اسے ایک ایسے پیکر کی صورت میں ڈھالتا ہے جس میں حقیقت اور تخیل ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

سائنس سے دلچسپی نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے تخلیقی پہلو کو کئی زاویوں سے جلا بخشی ہے۔ ان میں سے ایک زاویہ تکنیک پر گرفت کا ہے۔ ان کی تکنیکی گرفت ہنر کاری کا اعجاز ہے کہ ان کی کہانیاں قدم قدم پر اپنی پرتیں کھولتی ہیں اور ایک روانی کے ساتھ انجام تک قاری کو اپنے ساتھ بہائے لیے جاتی ہیں۔ دوسرا زاویہ حقیقت شناسی اور اشیاء و متعلقات کی تہہ میں اتر کر وہ کچھ جاننے کی جستجو ہے جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ یہ اندر کی بات ان کے کرداروں کی انفرادی نفسیاتی گرہ کشائی بھی کرتی ہے اور مجموعی انسانی کشمکش اور سیاسی سماجی منظر نامے میں معاشرے کا طبقاتی تجزیہ بھی ہوتا ہے۔ تیسرا زاویہ ان کے طرزِ استدلال کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ان کے موضوعات عموماً وہی ہیں جو اس وقت کے معروض کے موضوعات تھے جب یہ کہانیاں لکھی گئیں۔ یوں ان میں ایک طرف تو روحِ عصر کی خوشبو موجود ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی جو انفرادیت قائم ہوئی ہے وہ یہی طرزِ استدلال ہے۔ ان کے اندر کا ویژنسٹ (Visionist) ان کے ادبی سیلف سے مل کر ان کی کہانی کا جو خاکہ بناتا ہے اس میں استدلال اور تخیل بیک وقت اپنا کام دکھاتے ہیں۔

یہ مجموعہ مکمل نہیں کیونکہ ڈاکٹر انور نسیم نے اپنی تحریریں سنبھال کر نہیں رکھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرصہ سے ان کی توجہ سائنس کی طرف ہو چکی ہے۔ تلاش بسیار کے بعد جو چند تخلیقات مل سکی ہیں وہ اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ اصناف، تکنیک اور موضوعات تینوں حوالوں سے ان میں تنوع موجود ہے۔ شگفتہ اور سنجیدہ دونوں طرح کی تحریروں میں ان کا قلم یکساں روانی سے چلتا ہے۔ آخر میں ان سے لیا گیا ایک تفصیلی انٹرویو بھی شامل کیا گیا ہے جس میں ان کی زندگی، ان کی ادبی اور سائنسی خدمات اور کارناموں کے متعلق سیر حاصل گفتگو موجود ہے۔ ایک متحرک اور ہمہ جہت شخصیت کے ایک مضبوط لیکن نسبتاً کم نمایاں پہلو کو اُجاگر کرنے کی یہ کاوش اہلِ نقد و نظر اور عام قارئین میں یقیناً مقبول ہو گی۔

نام کتاب: ہم سب افسانہ ہیں   افسانہ نویس: اسلم سحاب ہاشمی   صفحات: ایک سو اٹھائیس   قیمت: ۲۲۰ روپے
ناشر: روہی پبلی کیشنز، ساہیوال   تبصرہ نگار: ڈاکٹر رشید امجد

اپنے آغاز سے اب تک اردو افسانہ متنوع تجربات اور اسالیب سے ہم آہنگ رہا ہے۔ ایک ہی عہد میں متوازی اسالیب اور تکنیک و ہیئت کے تجربات ہوتے رہے ہیں۔ یہی باغ کی رنگا رنگی ہے۔ ہمارے عہد میں بھی مختلف طرح کے لکھنے والے موجود ہیں۔ جدید علامتی انداز کے ساتھ ساتھ بیانیہ طریقہ کار بھی موجود ہے۔ جس میں کہانی کی بنت میں روایتی انداز کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ اسلم سحاب ہاشمی اسی قبیلے کے فرد ہیں۔ ان کی کہانیاں اپنے عہد کے انفرادی اور اجتماعی آشوب کی دین ہیں۔ کہانی بیان کرنے کا طریقہ اردو افسانے کی اسی بڑی روایت سے ہم آہنگ ہے جسے ہم افسانے کا سنہری دور کہتے ہیں لیکن اسلم سحاب ہاشمی روایتی انداز اور لب و لہجے کے افسانہ نگار نہیں بلکہ ان کے یہاں ایک استعاراتی سلیقہ موجود ہے۔ کہانی کی بنت میں فنی ریاضت جھلکتی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ یہ کہانی قاری کو گرفت میں لینے کی کتنی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس حوالے سے وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں کہ ان کے افسانے خود کو پڑھواتے ہیں اور قاری پر تا دیر اپنا اثر قائم رکھتے ہیں۔ رواں دواں سلیس بیانیہ اور سلیقے سے کہانی کہنے کا فن جانتے ہیں۔

نام کتاب: کوئی کمی سی ہے   شاعر: ساحل سلہری   صفحات: ایک سو اٹھائیس   قیمت: ۲۵۰ روپے
ناشر: دعا پبلی کیشنز، لاہور   تبصرہ نگار: شہزاد نیر

غزل کہنے کا فن بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس طرح کہ قافیہ ردیف جاننے والا ہر موزوں طبع سہولت سے غزل پہ غزل کہہ سکتا ہے (اور کہتا بھی جا رہا ہے) اور مشکل یوں کہ ایک کھرا مکمل، بے عیب، پر تاثیر اور تازہ شعر کہنا فی الحقیقت جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور اس میں بقول شخصے پتا پانی کرنا پڑتا ہے۔ یوں عہد موجود میں ٹنوں کے حساب سے غزل چھاپی جا رہی ہے لیکن کتنی غزلیں ایسی ہیں جن کا ہر شعر آپ سے نظر دگر کا مطالبہ کرتا ہے؟ کتنے اشعار سامنے دل تھام کر آپ کو روک لیتے ہیں؟ اگر آپ مؤثر غزل کے قاری ہیں تو یقیناً آپ کا جواب ہوگا "معدودے چند" قدما کا ایک قول کہیں نقل ہوا ہے (یہ مجھ تک سینہ بہ سینہ پہنچا ہے) کہ جس غزل میں ایک بھی اچھا شعر ہو وہ قابل اشاعت ہوتی ہے۔ موجودہ حالات دیکھتے ہوئے شاید ہمیں اس کلیے میں ترمیم کرنی پڑے۔ نئی غزل کا ہر شعر کسی نہ کسی حوالے سے (زبان، فن، ترکیب، بندش، ادا، مضمون وغیرہ) قابل توجہ ضرور ہونا چاہیے۔ کچھ عرصے سے ساحل سلہری کی بعض غزلیں پڑھنے سننے میں آتی رہی ہیں۔ فن غزل گوئی سے اس عزیز کی وابستگی دیدنی ہے۔ فروغ ادب میں بھی اس کا کردار قابل ستائش ہے۔ میں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ ساحل سلہری کی غزل مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ وہ مطالعے، مشاہدے اور ریاضت کے ذریعے اپنی تو فیق غزل گوئی میں مسلسل اضافہ کرتا رہا ہے۔ اب جدید غزل سے انسلاک کی آرزومند اُس کی غزل اس مقام پر پہنچی ہے۔ جہاں سے آگے کے راستے صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ اُس کے مصرعے کی بندش عموماً چست ہے یہاں وہاں نظر کو روکنے والے اشعار بھی نظر آتے ہیں۔ اس نے معاملاتِ دل و دنیا کو غزل میں سمونے کی اچھی کوشش کی ہے۔ غزل میں مجموعی طور پر اس کا جھکاؤ رومان پسندی کی طرف ہے۔ تاہم وہ عہد رواں کے فکری اور سماجی منظر نامے کے کٹا ہوا بھی نہیں۔ اُس نے بہت مناسب سلیقے سے اپنی بات حوالہ غزل کی ہے۔

میں ساحل سلہری کے شعری مجموعے "کوئی کمی سی ہے" کا کھلے بازوؤں استقبال کرتا ہوں۔

نام کتاب: محبت سانس لیتی ہے   شاعرہ: فصیحہ آصف خان   صفحات: صفحات ایک سو چھتیس   قیمت: ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتہ: کارواں بک سنٹر کینٹ، ملتان   تبصرہ نگار: انجم انصار

فصیحہ آصف خان بہت اچھی شاعرہ ہیں اور نثر نگار ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ ایک عورت کے دکھ سکھ کو بیان کرتی۔ ان کی نظمیں دلی جذبات و کیفیات کا واضح اظہار ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ مختصر سی نظم میں بھی ایک شعر میں بھی پورا افسانہ بیان کر دیا ہو۔ جیسے ان کی نظم "نئے موسم کی بات" نظمیں ہوں یا غزلیں، پڑھنے والے کو گداز محسوس ہوتی ہیں مگر اک دلربا انداز بھی اپنی پوری حساسیت کے ساتھ موجود ہے۔ جو دل قلب کا مکین ہوتا ہے وہ فصیحہ کی شاعری میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

فصیحہ کے اس پہلے شعری مجموعہ ''محبت سانس لیتی ہے'' میں اشعار کی رومانوی کیفیت، جدائی کی تڑپ اور آنے والے دل فریب لمحوں کی اُمید بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ان کی شاعری کو اور مزید بلندی ملے گی۔ کیونکہ سادہ مگر پُر اثر شاعری فصیحہ کی حساس ذہنی رو کی۔ بھر پور نشاندہی کرتے ہوئے سیدھی دل کی گہرائیوں میں جا کر پنہاں ہو جاتی ہے۔

نام کتاب: پانی کی کہانی شاعر: امین خیال صفحات: تین سو چھتیس ناشر: فروغ ادب اکادمی، اسلام آباد
قیمت: ۳۰۰ روپے تبصرہ نگار: محمد اقبال نجمی

پنجابی شعر و ادب کی بات کی جائے تو اس میں امین خیال ایک معتبر، منفرد اور مستند شاعر و ادیب کے طور پر اپنی الگ پہچان اور بلند مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ اردو ادب میں ماہیا کی صنف کے حوالے سے بات کی جائے تو اُردو ادب میں ماہیا کی صنف کو آج جو شناخت اور پذیرائی حاصل ہے اس میں امین خیال کا بہت بڑا حصہ ہے۔ امین خیال کی ماہیا سے گہری وابستگی اس سے محبت کی دلیل ہے۔ اُردو ماہیا کو تحریک کی صورت آگے بڑھانے، اسے ادبی حلقوں میں متعارف کروانے، ماہیا لکھنے والے شعرا کو بھر پور تعاون فراہم کرنے، شعرا کرام کو اردو ماہیا لکھنے کی طرف راغب کرنے اور پھر ماہیا کی کتب شائع کروانے میں اُن کا بھر پور کردار نظر آتا ہے۔ ''پانی کی کہانی''، ''یادوں کے سفینے'' کے بعد امین خیال صاحب کی دوسری کتاب ہے جو ماہیا روپ میں شائع ہو رہی ہے۔ ''پانی کی کہانی'' ہے جس میں موضوعات کا اس قدر تنوع ہے کہ اسے پڑھ کر خیال صاحب کے لیے بھر پور داد خود بخود ہونٹوں پر مچل جاتی ہے۔ ماہیا کی تکنیک، فن اور ہئیت اپنی جگہ ہمیں اس کے فکری کینوس کی دلکشی اپنی جانب ایسے متوجہ کرتی ہے کہ ہم اس کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔ ماہیا جیسی مختصر اور کومل سی صنف میں امین خیال نے اپنی فکر اور فلسفے کو بڑے اچھوتے پیارے اور لطیف انداز میں شامل کر کے اسے مالا مال کر دیا ہے۔ جو اُن کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔

نام کتاب: بے زمیں بے آسماں ناول نگار: اسلام عظمی صفحات: دو سو بائیس قیمت: ۴۰۰ روپے
ناشر: کاغذی پیرہن، لاہور تبصرہ نگار: شاہد شیدائی

ہمارے ہاں گزشتہ آٹھ دہائیوں میں افسانہ بہت لکھا گیا جس کا معیار دُنیا کی کسی بھی زبان کے افسانے سے کم نہیں۔ مگر اردو فکشن، ناول ایسی مضبوط اور پُر لطف صنف سے محروم ہی رہی۔ محروم اس لیے کہ کبھی کبھار کسی ایک دہائی میں ایک آدھ عمدہ ناول دکھائی ضرور دے جاتا ہے۔ مگر زیادہ تر ناول نگاروں میں ادبی معیار اور تخلیقی اُپج کی کمی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا ناول ادب کی مین سٹریم میں داخل ہونے سے قاصر رہا۔

تاہم پچھلی تین دہائیوں میں اُردو ناول لکھنے والوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اُردو فکشن کا دامن بہت جلد بین الاقوامی سطح کے عمدہ ناولوں سے بھی بہت جلد بھر جائے گا کہ اس صنف میں اب کافی کام ہو رہا ہے۔ سینئر فکشن رائٹرز کے بعد فاروق خالد، خالد فتح محمد، خالد جاوید، مرزا اطہر بیگ، وحید احمد، ایم اختر، عاصم بٹ اور بہت سے دیگر نثر نگار ادبی ناول کی تخلیق کاری کی طرف متوجہ ہوئے ہیں جن میں اسلام عظمی کا نام ان کے موجودہ ناول کی وجہ سے کافی روشن نظر آتا ہے۔

زیر نظر ناول مشرقِ وسطیٰ کی روزمرہ زندگی کے تناظر میں لکھا گیا ہے جہاں کئی ملکوں (خصوصاً جنوب مشرقی ایشیا) کے لوگ تلاشِ روزگار میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور ان میں بیشتر ایسے ہیں جو اپنی زندگی کا وافر حصہ وہیں گزار دیتے ہیں۔ اسلام عظمی نے اپنے گہرے مشاہدے کی روشنی میں وہاں کی زندگی میں سے ایک جیتی جاگتی کہانی چنی ہے جو پچھلی صدی کی آخری چار دہائیوں کے عرصے پر محیط ہے۔

یہ کہانی کریم الدین نامی ایک ایسے شخص کے گرد گھومتی ہے جو ناول کے شروع میں ایک جھلک دکھانے کے بعد دوبارہ اُس وقت نمودار ہوتا ہے جب وہ ساحل سمندر پر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہے اور ناول کا ایک اور اہم کردار ضمیر احمد اُسے مسٹر اولڈ مجنوں کے نام سے یاد کرتا ہے۔ کریم الدین کو ہم اس ناول کی مرکزی کردار ''رابعہ'' کے بعد دوسرا بڑا کردار کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں افراد ''دارا'' نامی جہاز کے دُبئی کے سمندر میں ڈوب جانے پر بھی زندہ بچ گئے تھے اور پھر زندگی کے کسی موڑ پر ان کی ملاقات ہو گئی تھی۔ جب وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور رابعہ ایک جوان، مطلقہ عورت تھی۔ کہانی کے معاون کردار ملک پرواز، جواد شاہ اور قادر

بخش بھی ناول میں جیتے جاگتے، چلتے پھرتے انسان نظر آتے ہیں کہ ان کے رہن سہن اور غم و شادی کی جھلکیاں پورے طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ چند لمحوں کے لیے سامنے آنے والے کردار مثلاً جولیا، جان کراسکی، بیکری کا بوڑھا اور شالنی وغیرہ بھی قاری پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔

''بے زمیں بے آسماں'' کا اسلوب نہایت سادہ اور دل میں اُتر جانے والا ہے۔ اسے ہم جدید اردو ناول نگاری میں ایک اضافہ قرار دے سکتے ہیں کہ اس کی کہانی، ترتیب اور کرداروں پر مصنف کی گرفت نہایت مضبوط ہے۔

نام کتاب: بحرِ تجلیات　　شاعر: ریاض ندیم نیازی　　صفحات: تین سو باون　　قیمت: ۷۰۰روپے

ناشر: ماورا پبلشرز، لاہور　　تبصرہ نگار: پروفیسر ڈاکٹر سید محمد بدیع الدین سہروردی

محترم ریاض ندیم نیازی علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ''بحرِ تجلیات'' سے پہلے ریاض ندیم نیازی کے دو شعری مجموعے ''خوشبو تری جوئے کرم'' اور ''ہوئے جو حاضر در نبیؐ پر'' سمیت کئی نعتیہ انتخاب شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ ''بحرِ تجلیات'' ان کی ہی نعتوں کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔

ریاض ندیم نیازی ایک نہایت ہی کہنہ مشق صحافی اور بہترین شاعر ہیں۔ میرے مرشد اور والد محترم حضرت علامہ سید محمد ریاض الدین سہروردی، قادری، چشتی، نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کا فیض اور ان کی تربیت جناب ریاض ندیم نیازی کو بھی حاصل ہے۔ حضرت علامہ سید محمد ریاض الدین سہروردیؒ بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ ریاض ندیم نیازی کا ذکر فرماتے اور ان کے کلام سے محظوظ ہوتے تھے۔ ریاض ندیم نیازی کی شاعری میں پختگی اور ندرت کے مقامات حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو شعر میں سمونے کے آداب اور آگہی بہت نمایاں ہے۔

نعت گوئی کے ساتھ ساتھ ریاض ندیم نیازی ایک خوش الحان نعت خواں بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا ہے کہ وہ ریاض ندیم نیازی کے کلام کو اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے قبول فرمائے۔ (آمین)

نام کتاب: سکوت　　شاعرہ: نزہت عباسی　　صفحات: ایک سو اڑتالیس　　قیمت: ۱۵۰روپے

ناشر: حیدر پرنٹرز کراچی　　تبصرہ نگار: ایس ایچ ہاشمی

شاعری بنیادی طور پر جذبات و احساسات کے اظہار کا انتہائی مؤثر اور کارگر ذریعہ ہے۔ شاعرِ فطرت ولیم ورڈز ورتھ نے اپنے نظریۂ شاعری کے حوالے سے کہا تھا کہ شاعری میں تفکر جذبے کی حدت سے پگھل جاتا ہے۔ نزہت عباسی کا کمال بھی یہی ہے کہ انہوں نے فکر و جذبے کو یک جان دو قالب بنا دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

کچھ دوستی کے داغ تھے، کچھ دشمنی کے زخم　　اب تجھ سے کیا کہوں مجھے کس کس سے کیا ملا

ان کا پہلا مجموعہ کلام ''سکوت'' وارداتِ قلب کے برجستہ اظہار کا خوبصورت نمونہ ہے۔ انہوں نے اپنے گرد و پیش پر گہری نظر ڈالی کہ جو کچھ محسوس کیا ہے اسے الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر پوری سچائی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

چھایا ہے اک سکوت سا اس کائنات میں　　برپا ہے پھر بھی شور یہاں شش جہات میں

نزہت عباسی نے آپ بیتی اور جگ بیتی کو بیان کرنے کے لیے اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف غزل کا انتخاب کیا ہے جو بلاشبہ ایک سدا بہار صنف ہے۔ یہ وہ صنف ہے جس کا حال اور مستقبل اس کے ماضی کی طرح روشن اور تابناک ہے اور جو روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ جدت کو بھی اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ نزہت نے اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کیا ہے بلکہ اظہار کے نئے پیرائے تلاش کرنے اور نئے پیکر تراشنے کی ایک کامیاب کوشش بھی کی ہے۔ اچھے شعر کی ایک خوبی یہ ہے کہ پڑھنے یا سننے والے کے دل کو چھو لے ''سکوت'' ایسے ہی اشعار کا خوبصورت مجموعہ ہے۔

دشت میں کیوں دل بے تاب لیے پھرتا ہے　　　　کس لیے دیدۂ بے خواب لیے پھرتا ہے

''سکوت'' گلہائے رنگا رنگ کا ایک حسین و دل نشین گلدستہ ہے۔

نام کتاب: خدا کے دن　　شاعر: شاہین عباس　　صفحات: ایک سو چھہتر　　ناشر: کاغذی پیرہن، لاہور
قیمت: ۲۵۰ روپے　　تبصرہ نگار: آغا تنویر　　ملنے کا پتہ: کتاب سرائے، اُردو بازار، لاہور

''خدا کے دن'' معروف شاعر شاہین عباس کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل اُن کے تین شعری مجموعے ''خواب میرا لباس'' (۱۹۹۲ء)، تحیر (۱۹۹۸ء)، وابستہ (۲۰۰۲ء) شائع ہو چکے ہیں۔ جدید غزل کے حوالے سے شاہین عباس سنجیدہ ادبی حلقوں میں اپنی معتبر شناخت بنا چکے ہیں۔ ۸۰ء کی دہائی کے بعد جو شعراء ادبی دنیا میں منظر عام پر آئے ان میں شاہین عباس کا نام سرفہرست ہے۔ ''خدا کے دن'' نعت، سلام اور غزلیات پر مشتمل مجموعہ کلام ہے۔ شاہین عباس کے اس شعری مجموعے اور اس سے قبل شائع ہونے والے شعری مجموعوں کو ناقدین فن نے سراہا ہے۔ اُن کی ایک غزل کے چند اشعار قارئین کی نذر:

پہلے تو مٹی کا اور پانی کا اندازہ ہوا　　　　پھر کہیں اپنی پریشانی کا اندازہ ہوا
اے محبت تیرے دُکھ سے دوستی آساں نہ تھی　　　　تجھ سا ہو کر تیری ویرانی کا اندازہ ہوا
رات اک دہلیز ایسی آ گئی تھی خواب میں　　　　رات کچھ کچھ اپنی پیشانی کا اندازہ ہوا

نام کتاب: حرف سلیم　　شاعر: سلیم صابر　　صفحات: ایک سو ساٹھ　　قیمت: ۲۰۰ روپے　　ناشر: شہر ادب، لاہور
ملنے کا پتہ: مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور　　تبصرہ: آغا تنویر

''حرف سلیم'' سلیم صابر کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ یوں تو بازار میں آئے دن شعری مجموعے منظر عام پر آتے رہتے ہیں لیکن بہت کم ایسے شعری مجموعے ہوتے ہیں جن میں قاری کو اچھی شاعری پڑھنے کو ملے۔ ''حرف سلیم'' اگرچہ تاخیر سے شائع ہوا مگر شاعری پڑھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ''دیر آید درست آید''۔ کسی شاعر سے فلیپ یا دیباچہ نہ لکھوانا بھی سلیم صابر کی خود اعتمادی کا مظہر ہے۔ اپنی بات میں سلیم صابر لکھتے ہیں ''میری شاعری کی مکمل بیاض عرصہ دراز پہلے دورانِ سفر گم ہو گئی تھی اور میں نے دلبرداشتہ ہو کر شعر و شاعری سے بہت حد تک کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔'' کنارہ کشی شاعری سے کسی صورت اختیار نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ یہ شاعر کے بس میں نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج سلیم صابر کا شعری مجموعہ ''حرف سلیم'' منظر عام پر ہے۔

شعری مجموعہ: دھانی حرف کی زرد کہانی　　شاعر: عمیر علی واصف　　صفحات: ایک سو اٹھائیس　　قیمت: ۲۰۰ روپے
ناشر: سانجھ پبلی کیشنز، لاہور　　تبصرہ نگار: آغا تنویر

''دھانی حرف کی زرد کہانی'' نوجوان شاعر عمیر علی واصف کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ نظموں پر مشتمل ہے۔ عموماً ہمارے ہاں غزل کی صنف زیادہ مقبول ہے اور پہلے شعری مجموعے غزلیات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بہرحال گزشتہ کچھ دہائیوں سے نظم رفتہ رفتہ مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ بعید نہیں کہ مستقبل میں نظم دیگر اصناف شعر کی نسبت زیادہ مقبول ہو جائے۔ عمیر علی واصف کے اس شعری مجموعے پر محمد انور زاہد، واجد امیر، نصیر بلوچ، زاہد حسن، سلیم سہیل اور پروفیسر ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ جدید غزل کے معروف شاعر واجد امیر لکھتے ہیں عمیر علی واصف کی نظمیں ایک تصویری نمائش ہے۔ وہ ہر تماشائی کو ان مناظر کی دلکشی، رنگوں کی دل آویزی، چہروں پر منجمد کیفیات، ذائقوں کی لذت، عشق و محبت کے افسانوں، کرداروں اور خوشبوؤں کی فرحت آگیں راحت سے متعارف کروا رہا ہے۔ وہ ان تصاویر میں ہیر، فقیر، گوتم، خوشی، غم سراب، اضطراب، استعجاب، حسرت، وجدان، تصوف، تخیل، حیات و ممات کے نقوش اُبھار رہا ہے۔

نامہ ہائے احباب

محترم حسن عباسی صاحب! السلام علیکم

اُمید ہے آپ معہ اہل و عیال خیریت سے ہوں گے۔ ایک غزل ''ارژنگ'' کے لیے ارسال خدمت ہے۔ کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے دیجیے مہربانی ہوگی۔ میرے لیے کوئی خدمت ہو تو ضرور لکھیے۔ فقط والسلام

نصرت صدیقی

فیصل آباد

***

واجب الاحترام حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ میں ضرورتاً چند دن کے لیے ایبٹ آباد میں ہوں۔ بوئی سے ڈاک منگوا لی تھی۔ ''ارژنگ'' بھی جلوہ فرما ملا۔ ارژنگ شعر و ادب سجا سجایا دیکھا۔ اس کی تمام تحریریں دل رُبا ہیں۔ نیازت علی نیاز اپنے ہزارے کے ہیں۔ ان کی تحریر ''کہانی کار'' خاص طور سے دیکھی۔ پسند آئی۔ رسالے کی باقی تحریریں بھی معیاری ہیں۔ آپ نے ارژنگ کی ادبی دیکھ بھال توجہ سے کرتے ہیں۔ شعری گوشے بہت اچھے ہیں۔ ان سے رسالے میں رونق ہو جاتی ہے۔ آپ کو اسلام آباد میں پروین شاکر ایوارڈ ملا ہے میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

خیر اندیش

آصف ثاقب

***

حسن عباسی بیٹا!

''ارژنگ'' ملتا رہتا ہے۔ بھیجنے کا شکریہ۔ ایک افسانہ بھیج رہی ہوں ''ہست و نیست'' اُمید ہے جلد ہی شامل اشاعت ہوگا۔ بہت دعاؤں کے ساتھ۔

نیلم احمد بشیر

***

محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ میں شدید معذرت خواہ ہوں کہ آپ نے ازراہ کرم مجھے ''ارژنگ'' کی ہر اشاعت پر یاد رکھا اور اس کے مختلف شمارے میرے ذوقِ مطالعہ کو ہر اعتبار سے سرشار کرتے رہے۔ میں اس کی طباعت و اشاعت کے اعلیٰ معیار اور اُس کے مندرجات کی حسن آفرینی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ نامور شعراء کے منتخب کلام کو چھاپنا اور انہیں نہایت آبرومندانہ طریقے سے متعارف کرانا ''ارژنگ'' کا خصوصی اعزاز ہے۔ ادبی خبریں/تقریبات بھی ادبی مجالس کے فروغ میں نمایاں حصہ دار بنتی ہیں۔ یہ کمی ضرور محسوس ہوتی ہے کہ آپ خود صاحب الرائے ہوتے ہوئے اپنے رشحات فکر و نظر سے (بطور دیباچہ) ہمیں نہیں نوازتے۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ ہر ماہ مختلف اصحاب سے پہلے سے رابطہ کر کے اُن سے ایک آدھ صفحے کی تمہیدی سطور لکھوا لیا کریں۔ بہر حال یہ محض مشورہ ہے۔ عامر بن علی اور ابرار ندیم صاحبان کو دعا و سلام۔ فقط آپ کا مخلص

سید ریاض حسین زیدی

ساہیوال

***

محترم حسن عباسی صاحب!

سلام مسنون۔ تازہ ''ارژنگ'' مل گیا ہے۔ ہر لحاظ سے خوش آیا۔ اس کے حسن میں آپ کی کاوشیں جھلملاتی نظر آتی ہیں۔ مرزا خورشید بیگ میلسوی کا مرے نعتیہ مجموعے ''مرا محور مدینہ ہے'' سے متعلق مضمون برائے ''ارژنگ'' بھجوا رہا ہوں۔ ان کا اس کتاب کے حوالے سے تبصرہ بڑا مبسوط ہے۔ ''ملالہ لوٹ بھی آؤ'' نظم بھی آپ کی نظرِ عنایت کی منتظر ہے۔ صرف یہ خیال ہے کہ موضوع پرانا ہونے سے پہلے یہ شائع ہو جائے۔ باقی خیریت جانیں۔ فقط والسلام

احمد جلیل

اوکاڑہ

***

برادر محترم جناب حسن عباسی

تسلیمات! اُمید ہے بخیریت ہوں گے۔ آپ

سے فون پر بات کر کے بہت اچھا لگا۔ ''ارژنگ'' بلاتوقف مل رہا ہے جس کے لیے ممنونِ احسان ہوں۔ یقیناً مواد و معیار کے اعتبار سے پرچہ روز افزوں ترقی کی منازل طے کر رہا ہے اور یہ سب آپ احباب کی بے لوث محنتوں کا ثمرہ ہے۔

تعمیل ارشاد میں تخلیقات ارسال خدمت ہیں۔ دعا ہے کہ پسند آ جائیں۔ نیز آپ کو حق حاصل ہے کہ جیسے چاہیں انہیں شائع کریں۔ آباد و شاد رہیں۔ احباب کو سلام

دُعاگو

غضنفر عباس سید

❁❁❁

بھائی حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ اُمید ہے آپ بفضلِ مولا بخیریت ہوں گے۔ ''ارژنگ'' باقاعدہ مل رہا ہے۔ آپ کی عنایت پہ سپاس گزار ہوں۔ زمستان کے شب و روز نے اپنے شکنجے میں لے رکھا ہے۔ جنوری کی پہلی دھوپ کی زیارت ہوئی ہے تو آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ ''ارژنگ'' حقیقتاً اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ تحریروں اور تصویروں میں یکساں خوبیاں ہیں۔ یہ خوبیاں آپ کی ذات کی خوبی کے باعث ہیں۔ یہ شکوہ ہے آپ نذیر اے قمر کے میڈرڈ (اسپین) ہاں ٹھہرے رہے اور مجھے بتایا تک نہیں۔ آپ کی مرضی باقی ملاقات پہ شکوے گلے، گلے لگا کر دور کریں گے۔ تازہ کلام حاضر ہے قبول فرمایئے۔

اسد اعوان

ساہیوال

❁❁❁

برادر حسن عباسی!

السلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ آپ کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا ماہنامہ ''ارژنگ'' ایک آدھ بار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بلاشبہ یہ خوبصورت اور معیاری ادبی جریدہ ہے اور اس میں شائع ہونا یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ یہی سوچ کر میں بھی اپنی دو تازہ غزلیں ارسال کر رہا ہوں۔ اگر آپ کے معیار پر پوری اُتریں تو شائع کر کے شکریہ کا موقع دیجیے گا۔ ممنون رہوں گا۔

آپ کو اور رسالے کی ٹیم کی پرخلوص سلام

آفتاب خان

لاہور

❁❁❁

میرے اپنے بھائی حسن عباسی

السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' پڑھنے میں بھی اچھا لگا اور دیکھنے میں بھی۔ ایک اور بات جو بہت اچھی لگی وہ یہ کہ آپ نے اس میں پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی برابر جگہ دی ہے۔ جس سے یقیناً ان کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

دستگیر شہزاد

ٹوبہ ٹیک سنگھ

❁❁❁

محترم المقام جناب حسن عباسی صاحب

السلام علیکم۔ احوال بخیریت بفضلہٖ بخیریت مطلوب! آپ کے حکم کی تعمیل میں کلام مرسل ہے۔ براہِ کرم شاملِ اشاعت فرما کر ممنون فرمائیں۔ شکریہ۔ ''ارژنگ'' ارسال فرما کر ممنون کر دیا کریں۔ مبارک باد کی خبریں مختلف اخبارات کی زینت ہو چکی ہیں۔ کٹنگ لف ہٰذا ہے۔ باقی اخبارات جب ہاتھ لگیں گے تو وہ بھی ارسال کر دوں گا۔ (انشاءاللہ)

دورۂ ناروے کی کامیابی اور قدم قدم پر کامیابی پر بھی آپ کو مبارک باد

ابراہیم حسان

حاصل پور

❁❁❁

سر احسن عباسی صاحب

السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' کا تازہ شمارہ پا کر جی خوش ہو گیا۔ اتنا دل کش اور پرکشش تحفہ جس کا طشت ہیروں جیسے الفاظ کا ایک ڈھیر ہے۔ پھول بھی ہیں، انگارے بھی، شعر و ادب کے قفس میں بند بجلیاں بھی۔ اس لطف خاص کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ آپ نے ''ارژنگ'' کے دائرہ کے باہر ایسے لفظ چھوڑے ہی کہاں ہیں کہ جواباً آپ کو لکھوں قلم، قلم بکھں رقم ہو گیا ہے۔ ویسے اس حق میں رقم کہاں کہ ان کو ارژنگ پہ نچھاور کر دوں۔ مزید شکریہ اور داد اس بات کے لیے کہ آپ نے اپنے اس عظیم و قیع شمارے کو آلہ جنگ نہیں بننے دیا۔ ورنہ آپ اگر ایک سل یا چٹان بھیج دیتے تو وہ کسی نہ کسی وقت فوج داری کا سبب بن سکتی تھی۔ اُس میں آپ کا ایک خاص فائدہ بھی ہے کہ ارژنگ بڑا ہے مگر حسن عباسی کا قد اس کی وجہ سے اور بڑھ گیا ہے۔

''آسمان، دائرہ اور میں'' آپ کی نظر کر رہی ہوں۔ میرے سجدہ ریاضت کو اُس کھاتہ میں ڈال لیجیے جسے قبولیت کا کھاتہ کہتے ہیں۔

نسیم سکینہ صدف

ڈسکہ

❁❁❁

محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ دُعائیں، اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ گزرتے ماہ ''ارژنگ'' موصول ہوا۔

زاہد تبسم صاحب نے بھجوایا تو اک تحیر آمیز خوشی کا گہرا احساس جاگا۔ سرورق سے لے کر ترتیب و تزئین اور کمپوزنگ ہر چیز میں آپ کا سلیقہ و نفاست نظر آ رہی ہے۔ آپ کی شاعرانہ و ادبی خصوصیات سے تو واقفیت تھی مگر تخلیق پبلی کیشنز اور ''ارژنگ'' کا تعارف واقعی میرے لیے نیا ہے۔ کچھ شاعری بھجوا رہی ہوں ماہنامہ ''ارژنگ'' کے لیے۔ تصاویر بلیک اینڈ وائٹ شائع نہ کریں پلیز سارا حسن مانڈ پڑ جاتا ہے۔ ''ارژنگ'' معیاری ادبی پرچہ اس کی انفرادی حیثیت میں اپنا حصہ پا کر مجھے خوشی ہوگی۔ بہت سی دُعائیں، محبتیں

فوزیہ غزل

❁❁❁

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ مزاج بخیر ہوں گے۔ حال ہی میں میرا پہلا شعری مجموعہ ''محبت سانس لیتی ہے'' منظر عام پر آیا ہے۔ سو ''ارژنگ'' کے لیے حاضر ہے۔ تبصرہ ہونے پر مشکور رہوں گی۔ اگر تبصرہ والا ''ارژنگ'' روانہ کر سکیں تو مشکور رہوں گی۔ والسلام

فصیحہ آصف خان

ملتان

❁❁❁

عزت مآب جناب حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ اُمید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ ''ارژنگ'' جیسے اعلیٰ پائے کے ادبی رسالے کے اجراء پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس بار ''ارژنگ'' کے تازہ شمارے کا تحفہ موصول ہوا۔ اس کے لیے آپ کی بے حد ممنون ہوں۔ اپنی نگارشات ارسال کر رہی ہوں۔ تاخیر کے لیے معذرت چاہتی ہوں۔ ''ارژنگ'' جیسے رسالے میں میری ''نگارشات'' کا شائع ہونا میرے لیے انتہائی خوشی اور اعزاز کی بات ہوگی۔ اُمید ہے آپ انہیں قریبی اشاعت میں جگہ دیں گے۔

کائنات طارق

جڑانوالہ

❁❁❁

مکرمی و محترم جناب حسن عباسی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آداب تسلیمات دُعائیں۔ عریضہ احوال آپ کی خیریت مطلوب چاہتا ہوں۔ طویل عرصہ کے بعد آپ کی شفقت آرائی کا شکر گزار ہوں۔ میں یہی سمجھتا رہا کہ لاہور میں بہت بڑے لوگوں سے تعلقات اور پھر مصروفیت اور ہم جیسے چھوٹے لوگوں سے وقت کا نکالنا خاصا دشوار ہو جاتا ہے لیکن آپ نے فون پر نہایت شفقت آمیز لہجے میں التفات فرمایا۔

آپ حسن صاحب یقین جانیے میری سوچ سے بالکل برعکس بات ہوئی۔ باقی اگر ناچیز کی طرف سے کوئی دوری کی علت آڑے آئی تو نہایت ادب سے معذرت خواہ ہوں۔ باقی آپ کے فرمانِ ذی شان کے مطابق کچھ کلام ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے ضرور حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

محمد امین ساجد سعیدی

حاصل پور

❁❁❁

جناب محترم برادرم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ بہ خیریت ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ بھی خوش ہوں گے۔ عرض ہے کہ آپ کے مختصر اور نہایت قلیل وقت کی ملاقات بھی یادگاری ہے اور میرے لیے اعزاز ہے کہ ہمارا بھائی اُردو زبان و ادب کے لیے جان توڑ کوشش کر رہا ہے۔ ہمیں آپ پر فخر ہے۔ رسائل اور اخبارات میں تو آپ کے چرچے ہوتے ہی ہیں مگر اب آپ کی شان میں ہم بھی عرض کرتے رہیں گے۔

''ارژنگ'' کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ اس میں ادبی معیار آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ بلاشبہ ''ارژنگ'' اعلیٰ ادب کا ترجمان ہے اور یہ آپ لوگوں کی محنت کا ثمر نظر آتا ہے۔ خدا آپ سب کو سلامت رکھے۔

''ارژنگ'' کے شمارے کے لیے کچھ چیزیں بھجوا رہا ہوں۔ حوصلہ افزائی کیجیے گا۔ میں ان شاء اللہ باقاعدہ بھجواتا رہوں گا۔ کیونکہ مضامین، افسانے اور شاعری میں بھی طبع آزمائی جاری ہے اور بکثرت شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ بھی ''ارژنگ'' کے پٹ کھول دیجیے۔ میرا اکمل ایڈریس یہی ہے جو لیٹر پیڈ کے ماتھے پر تحریر ہے۔ اسے اپنی میلنگ لسٹ میں ڈال لیجیے ممنون ہوگا۔ والسلام آپ کا بھائی

گل زیب عباسی

بہاول نگر

❁❁❁

جناب محترم ایڈیٹر صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کی ادارت میں شائع ہونے والا ادبی جریدہ ماہنامہ ''ارژنگ'' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ میں آپ کا بے حد ممنون و مشکور ہوں۔ بلاشبہ ماہنامہ ''ارژنگ'' اچھے ادب کا نمائندہ شمارہ ہے۔ اس میں شامل تمام مضامین شاعری، خبریں، کتابوں پر تبصرے اور دیگر تحریریں بہت ہی عمدہ اور پُراثر ہوتی ہیں۔

میری دعا ہے کہ آپ اور ''ارژنگ'' کے سرپرست اور اس سے تعاون کرنے والے تمام اصحاب کو خداوند عزوجل اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

خیر اندیش

حکیم ارشد شہزاد

❁❁❁

ادبی وثقافتی قلم قافلہ سپین کے زیر اہتمام پاکستان کے نامور شاعر حسن عباسی کے ساتھ ایک شام

صاحب شام حسن عباسی کی شاعری پر جاوید مغل، راجہ شفیق، افضال بیدار، ارشد نذیر ساحل اور حافظ احمد کی گفتگو

بارسلونا (کلچرل رپورٹر) ادبی وثقافتی تنظیم قلم قافلہ سپین کے زیر اہتمام سوک سنٹر داراسانس بارسلونا میں پاکستان سے آئے ہوئے نامور شاعر حسن عباسی کے ساتھ ایک شام منائی گئی، اس خوبصورت ادبی تقریب کے مہمانان خصوصی چیف ایڈیٹر ہم وطن سپین جاوید مغل، شاعر افضال احمد بیدار اور ڈائریکٹر ریڈیو پاسلونا راجہ شفیق کیانی تھے نظامت کے فرائض قلم قافلہ سپین کے جنرل سیکرٹری حافظ احمد نے انجام دیئے۔ جبکہ ارشد نذیر ساحل اور بہادر حسین صابر نے بھی اپنا کلام پیش کیا اور مہمان شاعر کو بارسلونا آمد پر خوش آمدید کہا۔ مقامی گلوکار جی شیخ نے شعراء کا کلام ترنم سے پیش کیا۔ مہمان خصوصی معروف شاعر حسن عباسی نے اپنے خوبصورت کلام سے محفل میں سماں باندھ دیا۔ آخر میں صدر قلم قافلہ ارشد نذیر ساحل اور مسلم لیگ ن سپین کے صدر چوہدری نذیر گوندل نے ادارہ ہم وطن کی جانب سے مہمان شاعر حسن عباسی کو شیلڈ پیش کی، جبکہ صاحب شام نے بارسلونا کے شعراء اکرام اور سنئیر صحافیوں کو اپنے شعری مجموعے پیش کیے۔ اس ادبی پروگرام میں پاکستانی وکشمیری کمیونٹی کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

لاہور آرٹس کونسل کے زیر اہتمام الحمراء ادبی بیٹھک میں
نوشی گیلانی اور سعید خان کے ساتھ ایک نشست

سٹیج پر عامر بن علی، سعید خان، نوشی گیلانی، عطاء الحق قاسمی اور اسد رضوی تشریف فرما ہیں، مسعود عثمانی اظہار خیال کر رہے ہیں
جبکہ تقریب کی میزبان صوفیہ بیدار بھی نمایاں ہیں

تقریب میں ملک کے نامور ادیب اور شعراء کرام شریک ہوئے

Read Online
www.amirbinali.com
www.millat.com